شمعِ فروزاں



شمعِ فروزاں

(نشریاتی تحریریں)

حصّہ اوّل

نظر برنی

بار اوّل ۔۔۔۔۔۔ ایک ہزار

کتابت ۔۔۔۔ تسلیم احمد ندیم بشیر کوٹی

قیمت ۔۔۔۔۔۔

اشاعت ۱۹۸۰ء

اعلیٰ پریس۔ بلیماران۔ دہلی

ادبی سنگم مولانا محمد علی جوہر مارگ جامعہ نگر

نئی دہلی ۔ ۲۵

مضامین/مقالات

شمعِ فروزاں

پبلشر
ادبی سنگم
مولانا محمد علی جوہر مارگ
نئی دہلی ۲۵

انتساب

اپنی ماں کے نام

جن کے

پاؤں کے نیچے

جنّت ہے

اظہارِ مدعا

میں نے اپنی زیرِ نظر کتاب کا عنوان "شمع فروزاں" (نشریاتی تحریریں) یہ سوچ کر قائم کیا ہے کہ انسانیت کی اعلیٰ اقدار زمان ومکان کی تمام قیود سے ماورا ہوتی ہیں۔ اور وہ ہمیشہ شمع فروزاں کی مانند روشن وتابندہ رہتی ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو کے اردو سروس پروگرام سے اس موضوع کے تحت ہر روز صبح کے وقت اقوالِ زرّیں سے مزیّن یہ پروگرام پابندی سے نشر ہوتا ہے اور سامعین میں بے حد مقبول ہے۔ یہ انشائیے انہیں ریڈیائی تحریروں پر مشتمل ہیں جو کہ ریڈیو پر مذکورہ پروگرام کے تحت وقتاً فوقتاً نشر ہوچکی ہیں۔

کتاب میں زندگی کے مختلف النوع مسائل اور موضوعات پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ جہاں تک اخلاقی محاسن کا تعلق ہے، ان کی اہمیت سے کونسا مذہب اور کونسا فرد ناواقف ہوگا لیکن

دیکھنا یہ چاہئے کہ ہم میں سے ایسے کتنے لوگ ہیں جو ان محاسن و اقدار کو اپنے روزمرہ کے معمولات میں برتنا جانتے ہیں؟ انگریز فلسفی سیفٹسبری اور ہچیسن نے اخلاقی حس کو ابھارنے کے لئے محاسبۂ ضمیر پر زور دیا ہے۔ لاک نے اخلاقی محاسن کی تفہیم کے لئے قانونِ خداوندی کو بنیاد قرار دیا ہے۔ دراصل نیکی و بدی کی پرکھ کے لئے اعمال کی چھلنی سے گذرنا ہی پڑتا ہے۔ اور اسی وقت یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ خدا کے نزدیک کیا چیز عزیز ہے اور کیا نہیں؟ کون سا عمل متروکہ ہے اور کون سا احسن؟ انسان کو کس عمل سے سچے معنوں میں مسرت حاصل ہو سکتی ہے اور کس عمل سے اذیت ہو گی؟

مشہور فلسفی بٹلر نے کسی جگہ تحریر کیا ہے کہ ہمارا ضمیر، انسانی تاثر کے ردعمل کا ایک ضابطہ ہے جس کی مدد سے انسان اپنے ارادۂ عمل کی تشکیل کرتا ہے۔ اسی سے انسانی شخصیت اور افکار مرتب ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا کا ہر دوسرا آدمی ذہنی اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے اور وہ اپنی جداگانہ طبیعت اور اطوار سے دوسرے کو متاثر کرنے کی دھن میں لگا ہوا ہے ایک عمل ایک شخص کے لئے باعثِ مسرت ہو سکتا ہے تو وہی عمل بیک وقت دوسرے کے لئے باعثِ زحمت بن سکتا ہے۔ گویا نیکی و بدی لازم و ملزوم ہیں اور ان کا دائرہ کار بھی یکساں ہے

انسانی فعل کے ارتکاب میں درحقیقت اس کے ضمیر اس کی صحبت اس کی تربیت کو زیادہ دخل ہے۔ تعقل و ادراک انسانی فعل کا سرچشمہ ضرور ہیں لیکن ان پر صحبت و تربیت کا بھی تسلط برقرار رہتا ہے۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ انسان کا کوئی عمل غیر شعوری یا غیر ارادی نہیں ہوتا۔ وہ جو کچھ کرتا ہے اس سے پہلے سوچتا ضرور ہے خواہ یہ سوچ لمحہ بھر کے لئے ہی کیوں نہ ہو؟ انسان جب یہ سوچتا ہے کہ یہ ہونا چاہیے تب لازماً اس کے جسمانی اعضاء حسبِ ضرورت حرکت میں آتے ہیں۔

اس "جاننے" اور پھر "سمجھنے" میں بھی کچھ فرق ہوتا ہے۔ شعور کا کام یہ اطلاع دینا ہے کہ فلاں شخص زید ہے لیکن یہ منصب محض تجربہ کے سپرد ہوتا ہے کہ وہ یہ واقفیت کرائے کہ زید اچھا شخص ہے یا کہ برا؟ تجربہ ہمارے شعور کے مبہم خطوط کو واضح کرتا ہے۔ اور کھرے کھوٹے کی پہچان اسی کے وسیلہ سے ہو جاتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں انسانی زندگی کے بعض اہم اخلاقی نکات کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ اور اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ انسانی کردار کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے۔ چنانچہ اس میں غرور کے ساتھ خاکساری کا، نیکی کے ساتھ بدی کا، دشمنی کے ساتھ دوستی کا، دکھ کے ساتھ سکھ کا، ناکامی کے ساتھ کامرانی کا خوف کے ساتھ اطمینان کا، انتقام کے ساتھ عفو و درگذر کا، محبت کے ساتھ نفرت کا اور انصاف کے ساتھ ناانصافی کا بیان کیا گیا ہے۔

تاکہ تصویر کے دونوں رُخ سامنے آجائیں۔ مضامین میں زبان کا چٹخارہ تو کم مل سکے گا۔ البتہ زندگی کی بعض حقیقتیں زیادہ نمایاں نظر آئیں گی۔ بزرگوں، دانشوروں اور حکما کے اقوال کی پیوندکاری سے نفسِ مضمون کچھ زیادہ دلچسپ دلا دیا اور دلکش ہو گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اس کتاب کے مشتملات صرف ریڈیائی تحریریں ہیں۔ ان موضوعات پر لکھنے کی ترغیب مجھے آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس کے دو اہم عہدیداروں جناب محمود ہاشمی صاحب اور محترمہ نجمہ رضوی صاحبہ سے حاصل ہوئی جس کا میں تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ دراصل یہی لوگ "شمع فروزاں" (ریڈیائی تحریریں) کے محرک ہیں جنکے التفاتِ پیہم کا شکریہ ادا نہ کرنا بڑی ناسپاسی ہو گی۔

نظر برنی

ریاکاری

ریاکار اور ظالم دنیا کا وہ بدترین شخص ہے جس کی طبیعت میں چھل کپٹ فریب اور دھوکہ ہوتا ہے، جس کی عقل پر ظلمتوں اور پراگندگی کے پردے پڑے ہوتے ہیں اور جس کے اعمال میں رذالت کی چھاپ ہوتی ہے۔ ایسا شخص نہ صرف اپنے معبودِ حقیقی کے دربار میں ذلیل و خوار ہوگا بلکہ اس کو دنیا والے بھی تھو تھو کرتے رہیں گے۔ ظلم اور ریاکاری ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں۔ جو شخص ریاکاری کا خوگر ہوتا ہے وہ ظلم کے دام میں بھی گرفتار نظر آئے گا۔ عبدالقادر جیلانیؒ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پاکؐ کے دشمنو! بندگانِ خدا پر ظلم کرنے والو! تم ظلم اور نفاق ظاہر میں ہو یہ ریاکاری کب تک چلے گی؟

"عالمو! زاہدو! تم بادشاہوں اور امیروں سے نفاق کرتے ہو تاکہ ان سے دنیا کا مال و متاع اور اس کی لذتیں حاصل کرو۔ تم اور اس زمانے کے اکثر بادشاہ۔ اللہ تعالیٰ کے مال میں، جو اس کے بندوں کے لئے ظلم اور خیانت کرتے ہو۔ اے اللہ! ریاکاروں کے دبدبے کو توڑ اور انہیں رسوا کر یا ان سے توبہ کرا۔ اے اللہ، ظالموں کو برباد کر اور زمین کو ان سے پاک کر، یا ان کی اصلاح کر دے۔"

ریاکاری انسان کو اندھا بنا دیتی ہے۔ عالم سر منبر جو باتیں کہتا ہے، ان کو عملی زندگی میں نہیں اپناتا۔ وہ دوسروں کو نصیحت اور خود کو فضیحت کا قائل ہوتا ہے۔ اللہ پاک قیامت کے دن سب سے پہلے ایسے ریاکار و منافق علماء کو سزا دیگا جنہوں نے زندگی بھر نیک راہ پر چلنے کی تلقین کی لیکن خود ہی بھٹک گئے۔

جو شخص ریاکار ہوتا ہے۔ وہ خود کو بڑا عقلمند، ذہین اور شاطر سمجھتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ خود فریبی میں مبتلا ہوتا ہے۔ وہ اپنے بنائے ہوئے خانوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ اور اس کا ضمیر ملامت کرنے لگتا ہے۔ ضمیر دراصل انسان کی نفسیاتی کیفیت کا وہ زندہ احساس ہے جس کے ذریعہ سے وہ نیکی و بدی میں تمیز کر سکتا ہے اور جس کے سبب اس کے دل کے اندر سے خود نیکی کی دعوت آواز اٹھتی ہے اور بدی سے اجتناب کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن بری صحبت، ریاکاری، بری تربیت یا کسی خاص شدید جذبہ کے اثر سے یہ آواز آہستہ آہستہ

دبنے لگتی ہے۔

رسول اللہ کا ایک ارشاد منقول ہے۔ آپ نے فرمایا "بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے اگر وہ توبہ کرلے تو وہ نقطہ صاف ہو جاتا ہے۔

چوں کہ ریاکاری انسان کو ڈھیٹ بنا دیتی ہے۔ اس لئے اندیشہ اس بات کا ہے کہ اس کو اپنے اعمال کی خرابی کا احساس ہی نہ ہو۔ وہ غرور میں اتنا سرشار ہو جاتا ہے کہ نیک وبد کی تمیز ہی نہیں رہتی لیکن یہاں بھی نبی آخرالزماں فرماتے ہیں۔" منزل مقصود کی جانب ایک سیدھا راستہ جاتا ہے۔ راستے کے ادھر ادھر دونوں طرف دو دیواریں کھنچی ہیں اور ان دونوں میں کچھ دروازے کھلے ہیں۔ لیکن ان پر پردے پڑے ہیں۔ راستے کے سرے پر ایک آواز دینے والا آواز دے رہا ہے۔ کہ راستے پر سیدھے چلو اور ادھر اُدھر مڑو نہیں جب کوئی راہ گیر خدا کا بندہ چاہتا ہے کہ ان دائیں بائیں کے دروازوں میں سے کسی ایک دروازہ کا پردہ اٹھائے تو اوپر سے ایک منادی پکار کر کہتی "خبردار۔ پردہ نہ اٹھانا، اٹھاؤ گے تو اندر چلے جاؤ گے۔ حضور نے فرمایا کہ یہی صراط مستقیم ہے۔ یہی قرآن ہے اور یہی خدا کی منادی ہے۔"

طمع و حسد

حسد کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے کو اچھا پہنتے دیکھ کر خوش ہونا. جس کو عام اصطلاح میں کہہ سکتے ہیں کہ فلاں شخص ہم کو دیکھ کر جل مرتا ہے یہ مرض عالمگیر ہے. مثال کے طور پر دو حقیقی بھائی ہیں. ایک کے اولاد کم اور دوسرے کے زیادہ. یا ایک کے لڑکیاں ہیں اور دوسرے کے لڑکے یا ایک بھائی کے اولاد ہے اور دوسرے کے یہاں نہیں. اب بھائی بھائی کو دیکھ نہیں سکتا. یہ لوگ خواہش رکھتے ہیں کہ خدا کا انتظام سب ان کی مرضی اور رائے سے ہو.

حرص و طمع سے بہت سی برائیاں پیدا ہو سکتی ہیں. بغض و عناد غصہ، جھوٹ، تکبر، غلیت وغیرہ وغیرہ. خدا کا محبوب ان خرابیوں سے گریز کرتا ہے. بھگوت گیتا میں ارشاد ہوتا ہے کہ خدا کا محبوب ترین وہ شخص ہوتا ہے جو کسی سے بغض نہیں رکھتا. سب کو دوست رکھتا ہے اور درد مندی کو اپنا شعار سمجھتا ہے. جو کسی قسم کا تکبر نہیں کرتا. تکلیف اور راحت

میں اپنے مزاج کو معتدل رکھنے کا سلیقہ جانتا ہے۔

ہر طرح کے کینہ، غصہ، عناد و بد خواہی کو دل سے نکال دینا چاہئے۔ مہاتما بدھ کا قول ہے کہ ان لوگوں کی جانب سے بھی بغض نہ رکھو جو تم کو نقصان پہنچاتے ہیں بلکہ محبت سے بھرپور نوازش اور احسان سے تمام جانداروں کو اپنا گرویدہ بنانا چاہئے۔ آدمی محبت کے ذریعہ فتحیاب ہو سکتا ہے۔ شرفا کو خیر کے ذریعہ شر پر غالب آنا چاہئے۔ حرص پر فیاضی سے اور جھوٹ پر سچ سے فتح پانی چاہئے۔ کیوں کہ نفرت کا علاج نفرت سے نہیں ہوتا۔ نفرت محبت سے دور ہو سکتی ہے۔

بھگوت گیتا کا قول کتنا مناسب اور حقیقت پر مبنی معلوم ہوتا ہے "حرص سے بڑی کوئی بدی نہیں"۔ بھرتری فرماتے ہیں۔

حرص کو نکال دو، عفو کی مشق کرو، شر سے نفرت کرو۔ امنگ ایک دریا کی مانند ہے خواہش اس کا پانی اور حرص اس کی لہریں ہیں میرے جذبات اس کے مگرمچھ، یہ جراءت کے درختوں کی جڑوں سے ٹکراتا ہے وہم اس کا بھنور ہے۔ تفکرات اور پریشانیاں اس کے کنارے۔ بھرتری نے کہا کہ کیا وہ دانا نہیں ہے۔ جس نے اس کو پار کر لیا ہو۔

جب غصہ کی لہر ایک بار آپ کو چھو جاتی ہے تو قطعی جبلی طور پر آپ کچھ اثرات جو یقیناً دیرپا ہوتے ہیں قبول کر لیتے ہیں۔ نفرت بغض اور عناد، غصہ، اور غیظ و غضب کی ٹھٹھری ہوئی کچھ جامد شکلیں

ہیں. نفرت دراصل غصہ سے بہت مختلف چیز ہے. لیکن غصہ کا ہر اظہار اس میں پسِ پردہ جھلکتا نظر آتا ہے.

ایک گدھا اور ایک بن مانس آپس میں بیٹھے ہوئے خدا کی ناشکری کر رہے تھے. گدھے کو یہ شکایت تھی کہ میرے سر پر سینگ نہیں اور بن مانس اس سے ناخوش تھا کہ افسوس میں دم سے محروم ہوں. چھچھوندر یہ باتیں سن کر بولی "چپ رہو" کم بختو! کفر مت بکو. مجھ کو دیکھو کہ سینگ اور دم کے علاوہ آنکھیں بھی نہیں ہیں.

تعلیم

تعلیم ایک سرچشمہ نور ہے جو زندگی کے مختلف شعبوں کی راہوں کو روشن کر دیتا ہے۔ ایک مفکر کا قول ہے کہ علم انسان کی تیسری آنکھ ہے جو اس کو تمام امور زندگی کی پہچان کرانے کے لئے بصارت عطا کرتی ہے مہابھارت سے منقول ہے کہ تعلیم کے مانند کوئی ایسی شے نہیں جو درک یقینی عطا کرے۔ روحانی اعتبار سے وہ ہمیں نجات دلاتی ہے۔ اور مادی دنیا میں وہ ہر طرح کی ترقی و بہبودی کا ذریعہ بنتی ہے۔

تعلیم کی روشنی ہر طرح کے دھوکوں سے بچاتی ہے۔ دشواریوں کو دور کرتی ہے۔ اور دل و دماغ کو راحت و سکون بخشتی ہے تعلیم ہماری ماں کی طرح پرورش کرتی ہے۔ باپ کی طرح راہ راست پر لاتی ہے اور بچوں کی طرح مسرت و آرام بخشتی ہے۔ وہ ہماری شہرت میں اضافہ کرتی ہے۔ اور ہمیں مہذب و متمدن بناتی ہے۔

تعلیم انسان کے تمام تعصبات کے اندھیروں کو دور کر دیتی ہے اور دوسروں کے نقطہ ہائے نگاہ کو سمجھنے اور پرکھنے میں معاون ثابت

ہوتی ہے۔ وہ عقل کو تیز کرتی ہے ۔ اور دل کو راحت پہنچاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی قوت تمیزہ کو فروغ دیتی ہے۔ مونٹیسری کہتا ہے کہ اگر تعلیم سے دماغ میں بہتر رجحانات پیدا ہوں اور قوت فیصلہ میں استقلال نہ آئے تو بہتر یہی ہے کہ میرا طالب علم ہمیشہ گنگشن ہی کھیلتا رہے۔

بعض ماہرین تعلیم نے تعلیم کے لفظ کو اس کے وسیع اور محدود دونوں معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس کے وسیع معنوں میں تعلیم و تہذیب نفس اور علاج ذات ہے اور اس کا عمل زندگی کے آخری لمحہ تک جاری رہتا ہے ۔ ایک مفکر کا قول ہے کہ حقیقی معنوں میں استاد وہی ہوتا ہے جو آخری دم تک طالب علم ہی رہے ۔ کوئی کالج یا نصاب کسی ڈاکٹر کو وہ سب کچھ سکھا نہیں سکتے جو اس کو سیکھنا ہے اور اس کی روزمرہ کا مشق رفتہ رفتہ اس کے احاطہ علم کو وسیع تر کرتی چلی جائے گی۔ یہ قصہ جو بات ایک ڈاکٹر پر صادق آتی ہے۔ وہی استاد، مصور، وکیل، تاجر، انگریز اش پر بھی صادق آتی ہے۔ ۔ایک اور مفکر کا قول ہے کہ ایک طوطا بھی چہار کلمات رٹ کر اپنا پیٹ بھر سکتا ہے ۔ تو کیا وہ شخص جس نے صحیح معنوں میں تعلیم حاصل کی ہے۔ اپنی روزی حاصل نہیں کر سکتا؟

تعلیم کی غرض و غایت جہاں طالب علم کی ذہنی و فکری صلاحیتوں کو ابھارنا ہے۔ وہاں اس سے ایک مفید شہری کی تربیت کا مقصد پورا کرنا بھی ہے۔

بھگوت گیتا میں آیا ہے کہ تعلیم انسان کا زیور ہے۔ یہ اس کا مخفی خزانہ ہے جو خوشی اور شہرت بخشتا ہے۔ ہمارے ہزاروں معلموں کا ایک معلم یہی تعلیم ہے یہی وطن سے دور بھی ہماری دوست ہے "یہی اسی کے باعث انسان اشرف کہلاتا ہے۔ گیتا میں ارشاد ہوتا ہے کہ کوئی دولت علم کے برابر نہیں اور ذلت کی زندگی سے بہتر کوئی موت نہیں۔

عدل

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے :۔

"اور اگر تو فیصلہ کرے تو ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کر بیشک اللہ انصاف سے فیصلہ کر، بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے"۔

انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ کسی کے ساتھ رعایت نہ کی جائے انصاف کی نگاہ میں گدائے بوریہ نشین اور امیر ابن امیر کی حیثیت یکساں ہے۔ آنحضرتؐ کے سامنے جب بھی اس طرح کا کوئی مقدمہ آیا تو آپؐ نے فیصلہ کرنے میں کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک مخزومی عورت نے چوری کی، قریش چپقلش میں پڑ گئے اور انھوں نے باہمی صلاح و مشورہ کیا کہ کون اس کے بارے میں سفارش کر سکتا ہے؟ پھر خود ہی کہنے لگے کہ کہ آپ کے چہیتے اسامہ کے سوا اور کون اس کی جرأت کر سکتا ہے؟ چنانچہ اسامہ نے سفارش کی۔ آپ نے فرمایا تم حدود اللہ کے متعلق سفارش کرتے ہو۔ پھر کھڑے ہو کر خطبہ دیا کہ تم سے پہلے کے لوگ اسی

لئے برباد ہوئے کہ جب ان میں کوئی صاحب وجاہت چوری کرتے تو چھوڑ دیتے اور جب کوئی بے کس چوری کرتا تو اس پر حد جاری کرتے خدا کی قسم اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی ارتکاب سرقہ کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا یہ عدل و احسان کا اتنا بڑا چارٹر ہے جس کی مثال دنیا آج تک نہیں پیش کر سکی۔ اس میں صرف انسانیت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ دین و مذہب، قوم و ملت اور ملک و وطن کی ذرا بھی تفریق نہیں کی گئی۔ ایک جگہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ "پس تو اس کو معاف کر اور درگزر، بیشک اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے"

بائبل میں ہدایت کی گئی ہے کہ مسیحی بندے اپنے پڑوسیوں کے ساتھ ہمیشہ انصاف برتیں۔ اگر خدا اپنی پروردگاری سے منصفی مقدمات کا عہدہ تمہیں بخش دے تو اس عہدے کے ذریعہ بالتخصیص بے انصافی حق تلفی اور ظلم کو دفع کرنا چاہئے اور امن و بہبودیٔ مخلوقات خدا کا لحاظ رکھنا چاہئے۔ کیوں کہ تم کو اپنے اعمال کا حساب خدا کے حضور میں پیش کرنا ہوگا۔

رُباعی:-

چاہئے انصاف ہر اک کام میں، روز و شب میں اور صبح و شام میں،
منصفی ہے شرط ہر اک فعل کی ابتدا اور وسط اور انجام میں

ضبط و باقاعدگی

اگر انسان کو اپنی ذات پر ضبط کا یارا نہیں تو کوئی کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا اور اگر طبیعت میں باقاعدگی نہ ہو تو یہ کس کام کی زندگی ہے؟

راستہ پر چلنے کے لئے ضبط نفس کی ضرورت ہے اور منزل کی جانب بڑھائے اور دو قدم واپس چلے تو پھر وہ کبھی منزل پر نہیں پہنچ سکتا بلکہ ساری زندگی چکر ہی کھاتا رہتا ہے۔

کسی بزرگ کا قول ہے کہ دانائی یہی ہے کہ خواہشات کو قوت ارادی کے باعث اور ضبط کے اندر رکھا جائے اور یہ چیز محض غور و فکر سے نہیں بلکہ شعوری کوشش سے ہی حاصل ہو سکتی ہے حقیقی اطمینان کے لئے خواہشات کو دبا کر رکھنا ضروری ہے۔

حضرت داتا گنج بخش فرماتے ہیں انسان کی ترکیب تین چیزوں سے ہے۔ روح نفس اور بدن ان میں سے ہر ایک کی ایک صفت ہے جس کے ساتھ وہ قائم ہے۔ روح کی صفت علم ہے نفس کی

خواہش اور بدن کی حس۔ انسان نمونہ ہے کل عالم کا اور عالم نام ہے دو جہاں کا چنانچہ انسان میں بھی دونوں جہانوں کا نشان موجود ہے عالم ظاہر کا بھی اور عالم باطن کا نشان بہشت، دوزخ اور میدان حشر ہے۔

قیامت میں جب تک مومن دوزخ سے خلاصی نہیں پائے گا، بہشت میں داخل نہیں ہو گا۔ اور حق تعالیٰ کے دیدار کی حقیقت نہیں پا سکے گا۔ اسی طرح ضبط و باقاعدگی کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ یہ ہوا ہے کہ جب تک انسان دنیا میں اپنے نفس سے نجات حاصل نہیں کرتا اور حق تعالیٰ کی صحبت تک نہیں پہونچتا وہ قرب الٰہی اور معرفت حق تعالیٰ کی حقیقت نہیں پا سکتا۔

مشہور مورخ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے۔

"انسان کی اجتماعی زندگی ہمیشہ سے ایک ایسے ضابطہ حیات اور قانون کی محتاج رہی ہے جو ہر چھوٹے بڑے کے ساتھ مساویانہ انصاف پر مبنی ہو اور ملکوں اور قوموں کے تمدنی و معاشرتی نظم ونسق کو اس طرح کنٹرول کر سکے۔

وہ آگے رقم طراز ہے۔

انسان کی اجتماعی زندگی کے لئے قدم قدم پر اصول، ضوابط اور قانون کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور جب یہ اجتماعی زندگی کسی مملکت کے ذمے ہوتی ہے تو اس کی یہ ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے

کیوں کہ دنیا کا کوئی نظام چاہے وہ اصولی اعتبار سے ایسے ضابطوں سے وابستہ ہے جو انسانی برادری میں اتحاد و یگانگت اور ملک کے اندر پائیدار امن و امان کا باعث بن جائے"۔

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک

والدین کی عظمت ہر قوم ہر ملت اور ہر مذہب میں مسلّم لیکن شاید کسی مذہب نے بھی اس تفصیل کے ساتھ والدین کے حقوق معین نہیں کئے ہیں جس طرح اسلام نے متعدد آیات قرآنی اور احادیث نبوی میں اس طرف توجہ کی ہے۔ سب سے پہلے ہم ایک نظر آیات قرآنی پر ڈالتے جائیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اللہ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کا برتاؤ کرو۔ اگر ان میں سے ایک یا ہر دو تمہارے سامنے بوڑھے ہوں۔ ایک اور جگہ فرمایا۔ "تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ اور والدین کے ساتھ احسان کرو"۔

ماں باپ کا تعلق اپنی اولاد کے ساتھ بالکل ایسا ہی ہے جس طرح رب العزت کا اپنی تمام مخلوق سے۔ یہ رشتہ وہ پاک رشتہ ہے جو حقیقت میں پروردگار عالم کی طرف سے ہمارے وجود اور ہماری سلامتی کا پوری طرح ضامن اور محافظ ہے۔ ماں باپ کی ان گنت اور پریشانیوں کا خیال کرو۔ جو انہیں اپنی اولاد کے پالنے پوسنے اور پھر انہیں بڑا کرنے تک پیش آتی ہیں۔ پھر سخت سے سخت تکلیف پر بھی تم نے کبھی ان کی پیشانی

پر بل دیکھا۔ بل کیا معنی، اس محبت کے چشمے میں وہ جوش و خروش ہے جو ہمیشہ اور زیادہ امڈتا ہوا اور ابلتا ہوا نظر آتا ہے۔

اولاد کے پھانس چبھ جائے تو وہ اپنا خون اس جگہ ٹپکانے کو آمادہ ہوتے ہیں۔

اولاد اس پیکر محبت کا جس قدر ادب و احترام کرے تھوڑا ہے۔ خدا نے ان دونوں کا درجہ اس قدر بڑھایا ہے کہ اپنی بندگی کے بعد ان کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا۔ فرمایا "تیرے رب کا حکم ہے کہ تو اپنے ماں باپ کو، ان میں سے ایک یا دونوں جب بوڑھے ہوں تو انہیں اف تک کہہ اور نہ مطلق جھڑک۔ دونوں سے نہایت ادب سے باتیں کرو۔ ان کے سامنے اپنے بازوؤں کو نہایت عاجزی اور مہربانی سے جھکائے رکھو۔"

اللہ سب گناہ معاف کر سکتا ہے لیکن والدین کی نافرمانی نہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص آنحضرت کے پاس آیا اور دریافت کیا کہ میری بھلائی اور حسن معاملہ کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے آپ نے فرمایا تیری ماں۔ پھر پوچھا کہ اس کے بعد فرمایا تیری ماں، اس نے پوچھا پھر اس کے بعد فرمایا تیرا باپ۔

ایک شخص نے نبی کریم سے دریافت کیا کہ میں جہاد کرنا چاہتا ہوں آپ نے پوچھا تمہارے باپ ماں ہیں؟ اس نے کہا ہاں۔ ارشاد ہوا کہ ان ہی میں جہاد کرو یعنی ان کی خدمت کرو۔ آپ نے تین بار فرمایا کہ میں تم لوگوں کو سب سے بڑے گناہ کی اطلاع دیتا ہوں۔ صحابہ نے

پوچھا کہ کہاں رسول اللہ۔ فرمایا شرک اور دوئم ماں باپ کے ساتھ بدسلوکی۔ اور تیسری جھوٹی شہادت۔

والدین اگر اپنی اولاد کو ایسا حکم دیں جو ان کو پسند نہ ہو پھر بھی درشت روئی سے پیش آنا چاہئے بلکہ ان کے ساتھ عاجزی سے پیش آنے ہی میں راحت نصیب ملے گی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اللہ کی رضا والدین کی رضا میں ہے اور اس کی ناراضگی والدین کی ناراضگی ہے۔

مہاتما بدھ کا قول ہے کہ جہاں اولاد ماں باپ کی عزت کرتی ہے وہیں سب سے بڑے دیوتا کا وصال ملتا ہے۔ سب سے بڑے دیوتا والدین ہیں۔ کیوں؟ ماں باپ اپنی اولاد کے لئے سب کچھ کرتے ہیں ان کی پرورش کرتے ہیں۔ اور نگہداشت بھی سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی رہنمائی بھی ان کے ذمہ ہے۔

انجیل میں ارشاد ہوا۔ "اولاد پر یہ بھی فرض ہے کہ اپنے مقدور کے مطابق اپنے مال سے اپنے والدین کی معشیت کا فکر اور اطمینان کرے جو اولاد ایسی ناشکر گذار ہے کہ بڑھاپے میں اپنے والدین کو مفلس اور لاچار دیکھ کر ان کی خبر گیری نہیں کرتی اور اپنے مال میں سے ان کو شریک خوشی کا نہیں کرتی وہ خدا کی نظر میں گناہ گار ہے۔ اولاد کا فرض ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کی فرماں برداری کرے۔"

عزم و استقلال

جب کوئی کام کیا جائے تو استقلال و عزم آہنی اور روشن پہلوؤں کو سامنے رکھنا چاہئے۔ اس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ آپ اپنے کام میں سرگرمی و انہماک اور دلی توجہ سے منہمک ہو جائیں گے اور کمزور اور بودے خیالات آپ کے پائے استقامت کو متزلزل نہیں کر سکتے۔ یہی جوہر کامیابی کی کلید ہے۔ فرینکلن کارٹر نے کامل یکسوئی یعنی ایک ہی مقصد پر تمام قوتوں کے اجتماع پر زور دیا ہے۔ بقول ملٹن جو شخص زیادہ مصائب برداشت کر سکتا ہے وہی اہم کام سرانجام دے سکتا ہے۔

دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں ایک وہ جو ہر چیز کے روشن پہلو پر نظر رکھتے ہیں وہ ہر کام کو اس یقین کے ساتھ شروع کرتے ہیں کہ اس میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ وہ پریشانیوں اور دشواریوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ وہ ناکامیوں پر اشک برسانے کے قائل نہیں ہوتے یہ مسئلہ ضرب المثل بن چکا ہے کہ خدا بھی انہیں لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔

دوسری قسم ایسے لوگوں کی ہے جو کمزور دل، قنوطیت پسند اور

بزدل واقع ہوتے ہیں۔ ایسے کام چور لوگ کام شروع کرنے سے پہلے کئی ماہ یہ سوچتے رہتے ہیں کہ ہم کو فلاں کام میں کامیابی مل سکتی ہے یا کہ نہیں۔ ان کے سامنے نتائج کا عفریت منہ پھاڑے کھڑا رہتا ہے وہ ناکامیوں سے خطرہ مول لینے پر یقین نہیں رکھتے۔ اس قسم کے لوگوں کو زندگی بھر کامیابی نہیں مل سکتی۔ قانونِ قدرت بھی ان کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

کسی دیہاتی ملازم سے کہا جائے کہ اس میز کو ہر روز صاف کر دیا کرو۔ لیکن خیال رکھو کہ چینی کے گلدان ٹوٹ نہ جائیں تو یقین جانئے کہ گلدان ضرور ٹوٹ جائیں گے۔ کیوں کہ آپ کے انتباہ سے اس کے دل میں نفسیاتی خوف بیٹھ جائے گا اور گلدان اٹھاتے وقت اس کے ہاتھوں میں ضرور رعشہ آجائے گا اور گلدان گر جائیں گے۔

اسی طرح ایک شخص دیوار کے منڈیر پر چلتا ہوا اگر خوف میں مبتلا ہو جائے کہ میں گر جاؤں گا تو وہ ضرور گر جائے گا حالانکہ دیوار پر چلنے کی حالت میں اس بھی اس کے پاؤں کے نیچے اتنی ہی زمین تھی جتنی کہ زمین پر چلنے کی حالت میں ہوتی۔ انگریز مفکر اور ادیب بیکن کا قول ہے کہ کسی چیز کے حصول کا خواہش مند ہونا اور اس کے لئے محنت و سختی اٹھانے کے لئے تیار نہ ہونا کمزوری اور سستی کی نشانی ہے۔ ایک شخص معمولی مرض میں مبتلا تھا لیکن ڈاکٹر نے اسے ایک مہلک بیماری کے وہم میں مبتلا کر دیا اسے یقین ہو گیا کہ میری موت یقینی ہے چنانچہ وہ کچھ عرصہ کے بعد مر گیا۔

اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ عزم و استقلال سے ہر لحاظ زندگی جیتا جاسکتا ہے۔ چیونٹی دیوار پر چڑھنے سے بار بار گرتی ہے لیکن یہ اس کا عزم آہنی ہوتا ہے۔ جو اب کو کامیابی کی منزل پر پہونچا دیتا ہے در حقیقت کام جتنا اچھا ہوتا ہے اتنی ہی زیادہ دقتیں اس کی تکمیل میں اٹھانا پڑتی ہیں۔ کمزور انسان مواقع کا متلاشی رہتا ہے جبکہ اور مستقل مزاج شخص خود موقع پیدا کر لیتا ہے۔

سکندر سے پوچھا گیا کہ بادشاہ دلیر کا کیا نشان ہے؟ کہا کہ جو یہ نہ پوچھے کہ دشمن کتنے ہیں بلکہ یہ پوچھے کہ کہاں ہیں؟ مجھے سخت کام پر اعتماد ہے جتنا سخت کام کرتا ہوں اتنا ہی کامیاب ہوتا ہوں۔

راجہ رنجیت سنگھ جب دریائے اٹک پر پہنچا تو آگے پار ہونے کا سامان یعنی کشتی وغیرہ کچھ نہ تھی۔ اس نے بلا تامل گھوڑا دریا میں ڈال دیا کسی نے کہا جناب یہ معمولی دریا نہیں بلکہ اٹک ہے۔ رنجیت سنگھ نے فوراً کہا جس کے دل میں اٹک اس کے لئے اٹک۔ چوں کہ وہ ہمت عالی اور اعتماد کامل رکھتا تھا۔ اس لئے دریا کے پار اتر گیا۔

سستی و کاہلی موت کا اعلان ہے سست ہو کر گھر میں پڑے پڑے مرجانے سے باہر نکل کر محنت کرتے کرتے تھک کر مرجانا بہتر ہے ؎

اگر کامیابی نہ ہو جی نہ چھوڑو
گرے بھی جو سو بار ہمت نہ توڑو

راستے میں پڑا ہوا بھاری پتھر کمزور آدمی کے لئے رکاوٹ بن جاتا ہے۔ لیکن طاقتور انسان اس پر پاؤں رکھ کر دوسری طرف کود جاتا ہے خطرات و مشکلات کا اطمینان کے ساتھ مقابلہ کرنا حقیقی مردانگی ہے۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا سیلِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

سوا سو سال کے ایک بوڑھے سے اس کی طوالتِ عمر کا راز دریافت کیا گیا تو اس نے ہنس کر کہا میں نے کبھی اس خیال کو اپنے نزدیک بھٹکنے نہیں دیا کہ میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔ میں نے ہمیشہ یہی سمجھا کہ میں جوان ہوں۔ جوان ہی رہوں گا۔ چنانچہ ابھی تک جوان ہوں۔

وقار یا خود اعتمادی

اپنے آپ کو انسان سمجھنا اور اپنی عزت آپ کرنا خودی نہیں کہلاتی۔ بلکہ یہ صفت تقویم اخلاق میں خودداری کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ خودی اللہ تعالیٰ کا وہ عطیہ ہے جو انسان کو تمام مخلوقات پر شرف و فضیلت بخشی ہے۔

اقبال کہتے ہیں:۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

یہ کلیہ ہے کہ جو شخص اپنی قدر آپ نہیں کر سکتا تو دوسرا شخص بھی اس کی قدر کیوں کریگا۔

وقار ایسا جادو ہے جو انسان کے سر پر چڑھ کر بولنے لگتا ہے۔ عزت نفس کی خاطر دنیا میں بڑے کام ظہور میں آتے ہیں۔ یہ آنکھوں میں بسے ہوئے خوابوں کی تعبیر ہے۔ اور دل کی دھڑکن بھی۔ جس شخص میں خودداری ہو گی، عزت نفس ہو گی۔ اور خوداعتمادی ہو گی، وہ کبھی کم ہمتی۔ پستی۔ بے حوصلگی۔ بے یقینی۔ مجبوری اور بے بسی کا شکار نہیں

ہو سکتا۔

خود داری کی بدولت انسان فطرت کا وجدان کائنات کی تسخیر اور ذات کی پہچان کر سکتا ہے۔ یہ فقیر کو شہنشاہیت عطا کرتی ہے اور خاک رواں کو سربلندی۔ قرآن میں ایسے اشخاص کو جری اور باہمت قرار دیا گیا ہے ایسے لوگوں کی بابت سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے۔

"اور جب ان کا گذر ہوتا ہے لوگوں کی بیہودہ باتوں پر
تو وہ باوقار شریفوں کی طرح گذر جاتے ہیں"

خود داری کا طرۂ امتیاز بھبوت یا خاک مل کر دنیا و مافیہا سے علیحدگی اختیار کرنا نہیں ہے بلکہ اس جذبہ کی پرورش اور پرداخت مخلوق خدا کے ساتھ حسن سلوک کرنے کے بعد ہوتی ہے۔

لفظ "ذات" یا "انا" یا "میں" فلسفیانہ اصطلاح میں اس کی دو قسمیں ہیں۔ فخر اور خود داری۔ ان میں خط فاصل کھینچنا امر محال ہے۔ شعور ذات کو بھی خودی کہہ سکتے ہیں۔ یہ فطری جبلت ہے اس سے کوئی بشر پہلو تہی نہیں کر سکتا لیکن اس کی شدت سے گریز لازم ہے۔

خود اعتمادی تکبر کی وہ ضد ہے جس سے انسان کو قلبی سرور حاصل ہوتا ہے۔ اور اس سے وہ معاشرہ میں معتبر مقام بھی حاصل کر سکتا ہے یہ جذبہ "کبر ذات" سے بالکل جداگانہ ہے۔

امام غزالی فرماتے ہیں کہ اپنے آپ کو عظمت اور دوسروں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے کا نام عُجب ہے۔ نیک نصیحت کے ماننے کی طرف طبیعت کا مائل نہ ہونا اور اپنی باتوں کی تردید سے رنجیدہ ہونا کبر کہلاتا ہے۔ عُجب وکبر اور فخر نہایت مہلک بیماریاں ہیں۔

ایک مرتبہ خلافت کے زمانہ میں حضرت عمر فاروق اعظمؓ اپنے کاندھے پر مشک لاد کر چلے جا رہے تھے، لوگوں نے اس کا سبب دریافت کیا کہ یہ حالت کیوں اختیار کی ہے۔ جواب میں فرمایا کہ میرے نفس میں بڑائی پیدا ہو گئی تھی اس لئے اس کو سزا دے کر ذلیل کیا ہے۔

روس کا ایک دانشور لکھتا ہے کہ دوسروں کو حقیر سمجھنا بے حد آسان ہے مگر خود کو حقیر سمجھنا بے حد مشکل ہے۔ حضرت خواجہ حسن بصری فرماتے ہیں، جس نے محفل میں اپنے آپ کو بُرا کہا اس نے اپنی تعریف کی اور یہ خود اعتمادی کی علامت ہے۔

خود اعتمادی ایسا جذبہ ہے جس کے باعث انسان بے سروسامانی کے باوجود تونگروں اور سرمایہ داروں سے بھی نگاہ ملا کر بات کر سکتا ہے۔ اور ان کو ہیچ سمجھ کر اپنی "انا" یا جذبۂ خودی کو آسودگی پہنچانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ ایک روز سکندر اپنے وزیر کے ہمراہ دیو جانس کلبی سے ملاقات کرنے کو آیا اور اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ سکندر کا خیال تھا کہ حکیم اس کی تعظیم کو اٹھے گا۔ مگر اس نے مطلق پرواہ نہ کی۔ یہ حالت دیکھ وزیر نے کہا۔ جناب سکندر اعظم فاتح دنیا مالکِ جہان آپ سے ملنے آئے ہیں۔

حکیم نے سر اونچا کیا اور مسکرا کر کہا جس سکندر نے ہوس دنیا کی خاطر جابجا ٹھوکریں کھائی ہیں۔ کیا وہ بادشاہ ہے؟ وہ تو دنیا کا غلام ہے۔ اس کے دلی جذبات اختیار میں نہیں ہیں۔ وہ جہاں چاہتے ہیں اسے بھگا لے جاتے ہیں۔ اور طرح طرح کے ناچ نچاتے ہیں۔ اس کے دل کو الٹ کر دیکھو اس میں غلامی کے زبردست نشانات ملیں گے۔ بادشاہ میں ہوں جو اپنے دل کو اپنے قابو میں رکھتا ہوں۔ سکندر اس بے پروا حکیم کی یہ حالت دیکھ کر اچنبھے میں رہ گیا۔ اور بولا۔ میں کچھ مال و زر آپ کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی اجازت دیجئے"۔ حکیم مسکرایا اور بولا:۔ تو میری دھوپ روکے کھڑا ہے۔ اس کو چھوڑ دے، یہی تیرا تحفہ ہے۔"

پاکیزگی

خیالات کا اثر اچھا ہو یا بُرا انسان کے جسم پر ضرور مرتب ہوتا ہے اور یہ ایک بہت ہی بہتر اور زندگی کے خاردار راستہ کو آرام و آسائش سے طے کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔ ابتدا ہی سے اپنے خیالات کو ایسا پاک و شفاف رکھا جائے کہ دماغ اور جسم پر ان کا اچھا اثر ہوگا جبتک خیالات میں پاکیزگی نہ ہوگی۔ ان کی روح اور جسم دونوں ہمیشہ عمدہ حالات میں رہیں گے۔

اخلاق و آداب ہی کے سلسلے میں قرآن پاک مطلع کرتا ہے۔

"اور سورہ سے دور رہو"

سورۂ توبہ میں اصحاب نبی کے ایک خاص طبقے کی صفائی پسندیگی اور اس کے خاص اہتمام کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا۔

"اللہ تعالیٰ ان دونوں کو بہت محبوب رکھتا ہے۔ جو خوب پاک صاف رہتے ہیں اور اس کا اہتمام کرتے ہیں۔"

انسانی دماغ کو ہمیشہ اچھے خیالات سے معمور ہونا چاہئے اور جب

خیالات اچھے ہوں گے تو خواہ تمہارا جسم کتنا ہی نحیف یا تکالیف میں مبتلا ہو تاہم وہ قابو میں رہے گا۔ تم دیکھتے ہو کہ جب آدمی ہمت کرتا ہے تو اپنی طاقت جسمانی سے زیادہ کام کر گذرتا ہے۔ یہ ہمت و قیمت طاقت صرف خیالات سے ہمیشہ تکلیف میں مبتلا ہو تاہم وہ قابو میں رہے گا۔ تم دیکھتے ہو کہ جب آدمی ہمت کرتا ہے تو اپنی طاقت جسمانی سے زیادہ کام کر گذرتا ہے۔ یہ صورت صرف افکار کی پاکیزگی سے عبارت ہے۔ میدان جنگ میں ایک سپاہی زخم کھانے کے بعد بھی آگے بڑھتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اور مطلق زخم کی پروا نہیں کرتا۔ کیوں کہ اس کا خیال صرف فتح کی عزت اور دشمن کی مدافعت کی طرف ہو جاتا ہے۔

حضرت ابو حازم ایک روز قصاب کے قریب سے گذرے آپ نے گوشت کی طرف دیکھا تو قصاب نے کہا۔ لے لیجئے۔ اچھا، عمدہ اور فربہ ہے فرمایا میرے پاس قیمت نہیں۔ قصاب نے کہا۔ میں مہلت پر دیدیتا ہوں۔ جب ہونگے دید یجئے گا۔ فرمایا میں اپنے نفس کو مہلت دیدوں گا۔

قصاب بولا۔ اسی لئے تمہارے پہلو کی ہڈیاں نظر آرہی ہیں۔

فرمایا: قبر کے کیڑوں کے لئے یہ کافی ہیں

پاکیزگی کا دوسرا نام خلوص ہے۔ یہ اگر کسی قوم یا کسی فرد سے غائب ہو جائے تو اس کے نقصانات بڑے دور رس ہوتے ہیں۔

ایک بزرگ کا قول ہے کہ میں نے پچاس سال میں پانچ ہزار کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اور ان میں سے صرف پانچ باتوں کو اپنے لئے قابل عمل منتخب کیا۔

(۱) اے نفس خدا کے دیئے ہوئے پر راضی رہ، ورنہ دوسرا مالک تلاش کر لے جو اس سے بھی زیادہ دیتا ہو۔

(۲) اے نفس جن باتوں سے خدا نے منع کیا ہے۔ ان سے بچتے رہنا ورنہ اس کے ملک سے باہر چلا جا۔

(۳) اے نفس اگر تو گناہ کرنا چاہے تو کسی ایسی جگہ کو تلاش کر جہاں خدا نہ دیکھے ورنہ گناہ مت کر۔

(۴) اے نفس تو اپنے خداوند کی عبادت کرتا رہ، ورنہ اس کا دیا ہوا رزق مت رکھ۔

(۵) اے نفس خلق خدا کے ساتھ خوش خلقی اور ہمدردی سے پیش آ ورنہ اپنی زبان بند رکھ اور کسی کے ساتھ تعلق نہ رکھ۔

ظاہری حسن پائیدار نہیں ہوتا اور یہ بہت جلد غائب ہو جاتا ہے۔ اس لئے انسان کو خارجی زیبائش و پاکیزگی کے مقابلہ میں داخلی پاکیزگی کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ داخلی پاکیزگی اس کو دنیا و مافیہا دونوں مقامات پر سربلندی عطا کر دیتی ہے۔ گل کی خوشبو کا زمانہ بہت جلد گذر جاتا ہے۔ اور اس کی جگہ کانٹا رہ جاتا ہے۔

حضرت لقمان حکیم فرماتے ہیں کہ اپنے نفس کی اصلاح و

سدھار کی فکر میں مشغول رہو۔ ورنہ کہ اس کے بناؤ سنگھار میں، تا کہ نجات پا سکو اور بجائے برائیوں کی خوبیاں پیدا ہو سکیں۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ جو خود اپنی اصلاح نہیں کر سکتا تو وہ دوسروں کے حق میں بھی اصلاح کرنے والا نہیں بن سکتا۔ گناہوں سے پاک نفس دلیر اور گنہگار بزدل ہو جاتا ہے۔

عقلمندی

عرب میں ایک کہاوت مشہور ہے کہ اس دنیا کے مزے جاہلوں کے واسطے ہیں اور تکلیفیں داناؤں کے لئے۔ بالفاظ دیگر اس دنیا میں عاقل اور جاہل کی زندگی یکساں نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ عاقل انجام کو دیکھتا ہے اور جاہل آغاز کو حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ شرافت عقل و ادب سے ہے نہ کہ مال و نسبت سے۔ اور عقلمند وہ ہے جو دوسروں سے عبرت حاصل کرے نہ کہ آپ دوسروں کیلئے باعث عبرت ہوں۔ حضرت سلیمانؑ کے دربار میں جب ملک یمن کی ملکہ بلقیس آئی تو اس کے ایک ہاتھ میں اصلی پھولوں کا ہار تھا۔ اور دوسرے ہاتھ میں مصنوعی پھولوں کا۔ یہ دونوں آپس میں مشابہ تھے کہ عقل اصل اور نقل میں تمیز کرنے سے قاصر تھی بلقیس نے کہا "اے عقلمند بادشاہ! بتاؤ ان میں سے کون سا ہار جھوٹا ہے اور کون سا سچا؟ سلیمانؑ چپ تھے کہ کیا جواب دیا جائے؟ درباری حیران و ششدر تھے کہ ملکہ نے یہ کیسی آزمائش کی۔ یکایک حضرت سلیمان کو ایک خیال آیا انھوں نے سر ہلایا اور ایک کھڑکی کو جس کی پشت پر محال کی مکھیوں کا چھتہ تھا، کھولدیا۔ کھڑکی کے کھلتے ہی کچھ مکھیاں

اندر آگئیں اور فوراً اصلی ہار پر جا بیٹھیں، ملکہ نے حضرت سلیمانؑ کی ذہانت اور عقلمندی کا اعتراف کر لیا۔

افلاطون سے کسی نے پوچھا کہ اعمال بد سے کون سا آدمی محفوظ رہ سکتا ہے۔ افلاطون نے کہا کہ وہ آدمی جو عقل کو اپنا امیر، پرہیز گاری کو اپنا وزیر، عبرت کو اپنا دبیر اور صبر کو اپنا دستور العمل بنا دیتا ہے۔

عقل کو عالم آب و گل میں جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ خدائے عزّوجل نے انسان کو اہل عقل ہونے کے باعث اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ عقلمند خوشی اور رنج دونوں کیفیتوں میں اپنے ہوش و حواس قائم رکھتا ہے۔ وہ نہ تو خوشی کے وقت پھول جاتا ہے اور نہ غم میں مضمحل ہوتا ہے۔ اسی لئے غوث الاعظم نے کہا ہے کہ عقلمند پہلے اپنے دل سے پوچھتا ہے۔ اور پھر منہ سے بولتا ہے۔ جب آدمی کا اقبال بلند ہوتا ہے تو خواہشات عقل کی تابع دار ہو جاتی ہے۔ اور جب ادبار آتا ہے تو عقل خواہشات کی مطیع ہوتی ہے۔ عقلمند خیر و شر میں مبتلا ہوتے وقت بہتر ین راستہ کا انتخاب کرتا ہے۔

زندگی بسر کرنے کے لئے انسان کو سب سے پہلے عقل کی ضرورت پیش آتی ہے۔ مشہور انگریزی شاعر شیکسپئیر کہتا ہے کہ عقلمند انسان کبھی بیٹھ کر اپنی تکلیف کا رونا نہیں روتا۔ بلکہ اپنی تکالیف کے تدارک میں فوراً مصروف عمل ہو جاتا ہے۔ ایک اور یورپی فلسفی کا خیال ہے کہ عقلمند اور بیوقوف دونوں میں کچھ نہ کچھ عیب ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ

عقلمند اپنے عیوب کو خود دیکھ لیتا ہے۔ اور دنیا نہیں دیکھتی اور بیوقوف اپنے عیوب کو آپ نہیں دیکھتا اور دنیا دیکھتی ہے۔

خدا کے نزدیک عقل سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ ارسطا طالیس کہتا ہے کہ عقل ہی وہ جوہر ہے جو انسان کو فضیلت مآب بناتا ہے۔ سلسلۂ نسب کسی کے واسطے باعث فخر نہیں ہو سکتا۔ جس شخص کے پاس عقل نہیں ہوتی وہ پچھلی باتوں کی فکر کرتا ہے۔ عقلمند جانتا ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتا اور بیوقوف جانتا ہے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ ہارون الرشید سے منصور حلاجؒ نے کہا کہ سب سے زیادہ عالم وہ ہے جو اطاعت کرے اور سب سے زیادہ جاہل وہ ہے جو نہ جانے اور بے پرواہ رہے۔

حکیم لقمان نے کتنے پتے کی بات کہی ہے۔ عاقلوں کی صحبت اختیار کرو۔ بردباری، راستی، دیانت بخشش اور فروتنی عقلمندوں کے نشان ہیں۔ اگر وہ کلام کریگا تو زبان پر نہ لائے گا۔ اگر کوئی چیز مانگے تو بخل نہ کرے گا۔

احسان کریگا اور مشکور ہو گا۔ تونگری میں میانہ روی اختیار کریگا۔ زیردستوں کو چشم حقارت سے نہ دیکھے گا۔ کار خیر میں کاہلی نہ کرے گا۔ اپنے حال سے دوسروں کو فائدہ پہنچانے کی فکر کریگا۔ ظاہر و باطن یکساں ہو گا۔ مال و جان کی پرواہ نہ کرے گا۔

عقل پر بھروسہ وہی کرتے ہیں جو اہل عقل ہوتے ہیں عاقل کو اسوقت گھبراہٹ ہونے لگتی ہے جب اس سے جاہل کی صحبت اختیار کرنے کے لئے

کہا جائے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے کہا کہ احمق کی دوستی سے بچنا چاہئے کیوں کہ وہ عقل کا دشمن ہوتا ہے جو نفع کے ارادے سے نقصان کر بیٹھتا ہے۔ اسی لئے حضرت سلیمان فرماتے ہیں کہ وہ شخص جو بیوقوف کے ہاتھ کچھ پیغام بھیجتا ہے، وہ اپنے پاؤں آپ کاٹتا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ نے اس بات کا اعتراف کیا کہ میں مُردوں سے زندہ کرنے سے عاجز نہیں آیا لیکن احمق اور نادان کی اصلاح سے عاجز آ گیا۔ اقبال نے بھرتری کی نظم کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

دوست

صحت، دولت، اور عقل کامیاب زندگی کی تثلیث ہیں لیکن اگر ان میں دوستی کو بھی شامل کر لیا جائے تو یہ انسان کی شادمانی و کامرانی کے لئے عناصر اربعہ سے تعبیر کئے جا سکتے ہیں۔ دوستی کو بلا مبالغہ صف اول کی خوبی کہنا چاہیے۔ جس شخص کو اچھے دوست میسّر نہیں وہ صحت دولت اور عقل کی موجودگی کے باوجود زندگی کا پورا لطف نہیں اٹھا سکتا۔ اس کی زندگی کی عمارت میں ایسا خلا پیدا ہو جائے جس کی تلافی کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ارسطو نے درست کہا کہ "جاہل اپنی ذات کا دشمن ہوتا ہے۔ پس جو شخص اپنا دوست نہیں ہو سکتا۔ وہ دوسرے کا کیا دوست ہوگا"؟ عبداللہ قتریی کا قول ہے کہ "دوستی ایسے شخص سے کرو جس کے پاس وہ تمام چیزیں موجود ہوں جن کی تمہیں ضرورت ہے"۔

مثل مشہور ہے کہ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہوتا ہے اگر آپ دشمن سے ایک بار ڈرتے ہیں تو عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ دوست سے ہزار بار ڈرتے رہیے کیوں کہ دوست اگر دشمن بن جائے تو اس کو نقصان پہنچانے کے ہزاروں طریقے معلوم ہیں۔ دشمن کو حقیر سمجھنا

اپنے ساتھ دھوکا کرنا ہے۔ اگرچہ آپ کا دشمن ریت کی رسی ہی کی طرح کیوں نہ ہو مگر تم اس کو سانپ سے زیادہ خطرناک سمجھ لو۔

دوستی کی آزمائش کے لئے گھڑی کا یقین ہے۔ بہترین دوست ہمیشہ آڑے وقت پر کام آتا ہے۔ کسی دانشور نے یہ بات بڑے وثوق سے کہی ہے کہ دوست کا امتحان مصیبت میں ہوتا ہے۔ بہادر کا امتحان جنگ میں ہوتا ہے۔ امام غزالی فرماتے ہیں کہ دوست وہ ہے جو تمہاری مشکل میں کام آئے۔ ایسے شخص سے بچو جو تمہاری صرف اچھی حالت کا دوست ہو کیوں کہ وہ سب سے بڑا دشمن ہے۔

بزرجمہر سے نوشیرواں نے پوچھا کہ تم کس شخص کا سب سے زیادہ عقلمند ہونا پسند کرتے ہو؟ کہا دشمن کا جبکہ وہ مجھ سے دشمنی کرے۔ پوچھا۔ یہ کس لئے؟ کہا اس لئے کہ میں اس کی ضرر رسانی سے محفوظ رہوں۔

افلاطون نے اس مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ انسان کا مرجانا اور دشمنوں کے لئے دولت چھوڑ جانا۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ زندگی میں اپنے دوستوں کا محتاج ہو۔"

دوستی کا رشتہ قائم کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ اس کے لئے دونوں فریقوں کو ایثار و قربانی کا سلوک کرنا پڑتا ہے۔ بزرجمہر سے نوشیرواں نے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ دوست کو دشمن بنانا تو ممکن ہے لیکن دشمن کو دوست بنانا ممکن نہیں ہوتا۔ کہا۔۔۔ اے بادشاہ

اس لیے کہ آباد مقام کو اجاڑنا آسان ہے۔ اجاڑ مقام پر آبادی کرنے سے ثابت شیشے کا توڑنا آسان ہے۔ ٹوٹے ہوئے شیشہ کو جوڑنے سے انیس کہتا ہے۔

خیال خاطر احباب چاہیئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

ہندو فلسفہ کا مت ہے کہ جھوٹے دوست کی بات کبھی نہ مانو۔ بہادر آدمی خطرے کے وقت پہچانا جاتا ہے۔ اور سچا دوست پریشانی کے وقت۔

دوستی خلوص اور راست گوئی کے پیمانے پر پرکھی جاتی ہے۔ اس کے لئے منافقت زہریلی عادت کے مترادف ہے۔ منہ پر دوستی کا دم بھرنا اور پیٹھ پیچھے مذمت کرنا ایسا ہے جیسا آب حیات میں زہر گھولنا جب ایک شخص کے پاس دوست ہیں تو سمجھ لیجئے کہ اس کے پاس خزانے ہیں۔ حضرت عثمان غنیؓ فرماتے ہیں کہ بدترین دشمن تمہارے بُرے ہم نشین ہیں۔ جبکہ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ اچھے دوست اور رفیق ایک لعنت ہیں۔ دوست سے دھوکہ کھانے اور دشمن سے مغلوب ہونے سے بچتے رہیئے۔

وسیع القلب انسان ہی کو دوستی کا سچا لطف حاصل ہوتا ہے چھوٹی موٹی غلطیوں کو نظر انداز کرنا، قربانی و ایثار کے جذبہ سے مملو ہونا بے لوث بے غرض سلوک کرنا اور اپنی مسرتوں کو اپنے دوستوں کے

ساتھ مشترک کرنے کا نام دوستی ہے۔ ایسے شخص کی دوستی سے بچتے رہئے جو سب سے زیادہ تمہاری اس ٹوہ میں لگا رہے کہ تمہارے تمام راز اس پر پوشیدہ نہ رہیں۔ کیوں کہ وہ دوستی تم سے منقطع کریگا اور تم کو اپنا قیدی بنالے گا۔ ایک انگریزی مصنف لکھتا ہے کہ دوستی کے بندھن کو مضبوط بنانا ہے تو دوستوں سے ملتے رہئے۔ اگر بہت ہی مضبوط بنانا ہے تو کبھی کبھار ملئے۔

حیا

شرم وحیا اور عفت و پاکدامنی ان اخلاقِ حسنہ میں سے ہیں جن پر ہر مذہب نے خاص طور پہ زور دیا ہے. قرآن پاک نے بے حیائی یا اخلاقی آلودگی سے پرہیز کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ قرآن میں منہیات و محرمات کے بیان میں کئی جگہوں پر پہلے نمبر پا سی کا ذکر کیا گیا ہے. فرمایا:۔

"منع فرمایا ہے بے حیائی سے اور عام برائی سے اور ظلم و زیادتی کرنے سے اللہ تعالی تم کو یہ نصیحت کرتا ہے. تا کہ تم نصیحت پکڑو".

دوسری جگہ پہ ارشاد ہوتا ہے.

"اے رسول آپ لوگوں کو فرمائیے کہ میرے رب نے حرام کر دیا ہے. سب بے حیائی کی باتوں کو، جو ان میں سے اعلانیہ ہوں اور جو چھپی ہوئی ہوں"

بے حیائی لفظ سے جابریت کی بو آتی ہے کیوں کہ جس شخص میں اس کا فقدان ہوتا ہے اس میں ادب و لحاظ، ہمدردی و خلوص، مہرو وفا اور خلق و مسرت کا دور تک پتہ نہیں ہوتا اس برائی کے فتنے انفرادی اور اجتماعی دونوں اعتبار سے مضرت رساں ہوتے ہیں۔

معاشرہ کا کھوکھلا پن اس کا اصل جوہر ہے۔ یہ انسان کی ترقی میں انجماد پیدا کر دیتی ہے۔ اسلام میں بے حیائی کی باتوں سے اجتناب کرنے کی تلقین کرتے ہوئے حکم دیا گیا ہے کہ نامحرم مردوں اور عورتوں کا جب سامنا ہو جائے دونوں نگاہیں نیچی کر لیا کریں۔ ایک دوسرے کی طرف نہ دیکھا کریں پردہ کی تاکید اسی شرم و حیا کو برقرار رکھنے کے پیش نظر کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

"اے نبی! مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی عصمت و عفت کی حفاظت کریں۔ یہ ان کے لئے زیادہ پاکیزگی کا طریقہ ہے۔ یقیناً اللہ جانتا ہے کہ جو کچھ وہ کرتے ہیں اور مومن عورتوں سے کہو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی عصمت کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں۔ سوائے اس زینت کے جو خود ظاہر ہو جائے اور وہ اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل مار لیا کریں۔"

حکماء کا خیال ہے ــــ الحیا من الایمان ــ بعض کہتے ہیں جس میں شرم نہیں وہ انسانیت سے خارج ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ حیا انسانیت کا خاصہ ہے جو شخص شرم نہیں رکھتا وہ انسانی جماعت میں عزت اور توقیر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔

حضور اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ حیا ایمان کی شاخ ہے حضرت علیؓ فرماتے ہیں "جس نے شرم کا جامہ پہن لیا لوگ اس کے عیب نہیں

دیکھ سکتے"۔ حضرت امام حسن رضؓ نے دس مکارم اخلاق بیان کئے ہیں۔

(۱) زبان کی سچائی

(۲) جنگ کے وقت حملہ کی شدت

(۳) سائل کو دینا

(۴) حسن خلق

۵ احسان کا بدلہ احسان سے دینا۔

(۶) صلہ رحم

(۷) پڑوسی کی حفاظت وحمایت۔

(۸) حق دار کی حق شناسی

(۹) مہمان نوازی

(۱۰) ان سب سے بڑھ کر شرم وحیا۔

بےحیائی انسان کو اندھا بنا دیتی ہے۔ جو شخص بے حیا ہوتا ہے اس کو سود وزیاں نشیب وفراز اور رطب ویابس کا اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ اس کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ ایک خوبصورت عورت اپنے گھر کی کھڑکی میں سے ہمیشہ جھانکا کرتی تھی۔ یہ عورت نہایت حسین وجمیل تھی اور بے پردہ رہا کرتی تھی۔ اس کو رسوائی یا بدنامی کا ڈر بھی نہیں تھا۔

یہ عورت ایک دن اپنے خورد سال بچہ کو لیکر کنویں پر پانی بھرنے

گئی وہاں ایک خوبرو اور جوان آدمی کو دیکھا تو وہ اس پر فریفتہ ہوگئی اور اتنی مدہوش ہوئی کہ بجائے گھڑے میں رسی باندھنے کے اس نے اپنے بچے کی گردن میں رسّی باندھ لی۔ اور اس کو ڈول کی مانند کنویں میں لٹکا دیا۔ بچہ چلاّتا رہا۔ اس کی آواز سن کر آس پاس کے لوگ جمع ہوگئے اور بچّہ کی جان بچائی لیکن اس بے حیا عورت کو قطعی خیال نہ آیا۔

حیا۔ شرافت، وانسانیت کا زیور ہے جس انسان کی آنکھ کا پانی بہہ جاتا ہے۔ وہ سماج کے لئے ناسور سے کم نہیں ہوتا۔ یہ وقت کے طوفان خیز تھپیڑوں کا منہ موڑ سکتی ہے۔ اور یہ کبھی گلوں کی عطر بیز ہواؤں سے اپنا لباس فاخرہ معطّر کر لیتی ہے تو کبھی ستاروں کی روشنی کو اپنی مٹھی میں بھرنے کا مظاہرہ کرتی ہے۔ یہ خوشامد، عیاری، کذب، مکاری اور فریب کے دانت کھٹّا کرتی ہے۔ حیا انسان کا داخلی وصف ضرور ہے۔ لیکن اس کی بدولت اس کے اخلاق کا تار و پود بھی متاثر ہوتا ہے۔ حیا وہ قوت ہے جو انسان کو بدکاری اور بدفعلی کے اقدام سے روکتی ہے۔ اور انسانی جبلت کے غلبہ سے ہونے والے گناہوں کو سر اٹھانے نہیں دیتی۔

حق گوئی

حق گوئی کو معاشرہ میں جہاد اکبر قرار دیا گیا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی نیکی اور قابل قدرت صفت ہے جو ایک فرد کو اپنے معاشرہ میں اشرف و افضل بناتی ہے۔ حضور اکرمؐ نے جو اسلامی معاشرہ قائم کیا، اس کی بنیادی خصوصیات میں حق گوئی نمایاں خصوصیت تھی۔ حق بات کو پوشیدہ رکھنے سے زیادہ بدتر کوئی چیز نہیں۔ ایسے شخص کو قیامت میں آگ کی لگام لگانے کی دھمکی دی گئی ہے۔

حق گوئی ضمیر کے بطن سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ کسی کے ترغیب دلانے یا طعنہ دینے سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ دنیا کے عظیم ترین لوگ وہی ہوتے ہیں جنکو یہ خصوصیت ودیعت ہوتی ہے۔ ضمیر جو کہ معروف احکام کا پابند ہے، نیکی کی داخلی آواز کہلاتا ہے۔ غریب اور مظلوم شخص کی افتاد دیکھ کر مدد اور رحم کا جو جذبہ انسان کے دل میں ابھرتا ہے۔ اور اس کی دستگیری کے لئے انسان کے دل میں جو تڑپ ہوتی ہے، اسی ضمیر کی آواز نیک انسان کے کردار و گفتار کی شکل میں حق گوئی بن کر ظاہر ہوتی ہے۔

حق گو حالات کے موافق ہونے کا انتظار نہیں کرتا، بلکہ وہ ہر نشیب وفراز کو پس پشت ڈال کر انصاف وصداقت کو لبیک کہتا ہے خواہ اس کے نتائج اس کو لاکھ پریشانیوں میں مبتلا کر دیں۔

حضورؐ نے مومن کو داخلی طور پر اس طرز کی تعلیم دیکر اس حق کی حمایت اور باطل کی مذمت کے لئے تیار کیا اور اس کو ایک ایسے خاص سانچے میں ڈھالا ہے جو باطل کے نقشہ میں کبھی موزوں نہیں ہو سکتا حق گوئی کا حقیقی جوہر اس وقت کھلتا ہے جب وہ فرد کی طرف سے جماعت کے مقابلہ میں، شہری کی طرف سے ریاست کے مقابلہ میں، مظلوم کی طرف سے ظالم کے مقابلہ میں، اور کمزور کی طرف سے طاقتور کے مقابلہ میں بلند کی جاتی ہے۔ حق گوئی کی مزاحم قوت صرف ایک ہے اور وہ ہے خوف یا اسے موجودہ عہد میں مصلحت کا نام دیا جاتا ہے۔ خوف کی موجودگی اور اس کے علی الرغم سچی بات کا نام ہی حقیقی حق گوئی ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:۔

" اور یہ لوگ (اہلِ ایمان) کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔

اسلامی ریاست کے سفیر بن کر حضرت مغیرہؓ بن شعبہ ایران کے دربار میں پہنچے تو بھرے دربار میں گذرتے ہوئے سیدھے بادشاہ کے تخت پر جا چڑھے۔ اور اس کے کاندھے کے ساتھ کاندھا بھڑا کر بیٹھ گئے۔ درباریوں نے یہ صورت حال دیکھی تو انہیں تخت سے نیچے

اتار دیا وہ کہنے لگے "مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم لوگوں نے اپنے بادشاہ کو خدا بنا رکھا ہے۔ ہمارا خلیفہ تو ہمارے درمیان ہمارے برابر بیٹھتا ہے"۔

حق گوئی کی اس تربیت کی خاطر ہی حضورؐ نے فرمایا تھا۔

"تم میں سے جو شخص برائی کو دیکھے اور اس کو ہاتھ سے مٹا دینے کی طاقت رکھتا ہو تو اسے ہاتھ سے مٹا دے ورنہ زبان سے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے لیکن یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے"۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور موقع پر فرمایا:۔

"ہوشیار رہنا کسی کی ہیبت تم کو اس حق بات کے کہنے سے باز نہ رکھے جو تم کو معلوم ہے"۔

شری مد بھگوت گیتا کے سولہویں مکالمے کے ابتدائی چند بندوں میں ان اوصاف کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:۔

بے باکی، صفائی جسم و قلب، خیرات، بیزاری، حق گوئی جرات اور نرم مزاجی۔

مہاتما بدھ کا قول ہے کہ وہ باتیں ہرگز نہ کہو جو جھوٹ ہیں بلکہ حق گوئی اختیار کرو۔ کسی کو نقصان پہنچانے کی غرض سے نہیں بلکہ اپنے دل میں سب کی محبت رکھ کر۔ سچ بولو۔ لیکن مغلوب الغضب نہ ہو جاؤ۔ سوال کرنے پر جواب دو۔ ان خوبیوں کے اپنانے سے آپ کی شخصیت مقدس بن جائے گی۔

بھگوان رام چندر نے بھی ایک جگہ تلقین کی ہے کہ دھرم کی حفاظت

حق گوئی سے ہوتی ہے۔ آدمی ہمیشہ ایسی کوشش اور کشمکش میں لگا رہتا ہے کہ کسی صورت مسرت حاصل ہو جائے۔ اور چونکہ مسرت ہی "کرم" کا پھل ہے اس لئے اس لازمی طور پر یہ جاننا چاہئے کہ کیا خیر ہے اور کیا شر۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم ہندوستان کے ہر مفکر نے یہ ضروری سمجھا کہ کردار کے چند اصول وضع کئے جائیں اور ان اصولوں میں حق گوئی کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ منوسمرتی میں ایک فقرہ ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔

"حق بات کہو، اسے تلخ نہ بناؤ۔ میٹھا جھوٹ نہ بولو، یہی قدیم قانون ہے۔"

ظلم

اللہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہوتا ہے۔" بیشک اللہ ذرّہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا یعنی کسی درجہ میں بھی ظلم، ذرہ برابر بھی خدا بندوں پر نہیں روا رکھ سکتا۔ ایک دوسرے موقع پر پھر اطمینان دلاتے ہوئے فرمایا :۔

" اور اللہ جہاں والوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا۔"

عدل ظلم کا مثبت پہلو ہے اگر فلسفہ کائنات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ عدل کی بنیاد پر کائنات قائم ہے۔ اسی کے محور پر زمین و آسمان کا نظام جاری ہے حکومت کی بقا اور مقبولیت کے لئے عدل کی ترازو جتنی ضروری سمجھی گئی ہے، غالباً ہتھیار اور فوج کو بھی اتنی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ بعض سلاطین دوراں نے اپنی حکومت کا نشان ہی ترازو یعنی عدل کو منتخب کیا برسر اقتدار شخص کے لئے لازم ہے کہ وہ عدل سے کام لے اور ظلم و بے انصافی سے پہلو تہی برتے۔ اس کو نہ صرف دنیا میں سربلندی

ملے گی. بلکہ وہ آخرت کی کھیتی بھی خوشگوار شکل میں حاصل کر سکتا ہے۔

رعایا یعنی جمہور کو عدل کی صفت سے ہم کنار کرانے کے لئے حاکم کا فرض ہے کہ محکوم کا لحاظ رکھے اور یہ دیکھنا چاہئے کہ ان کے ساتھ ناانصافی تو نہیں ہو رہی ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ محمود غزنوی کی خدمت میں ایک ضعیفہ حاضر ہوئی اور فریاد کی کہ ڈاکوؤں نے اس کا مال لوٹ لیا ہے اور اس کے جوان بیٹے کو قتل کر دیا ہے. محمود نے کہا کہ وہ دور دراز علاقہ ہے اس لئے وہ اس کی مدد کرنے سے قاصر ہے بڑھیا چہک کر بولی "اگر تم انتظام نہیں کر سکتے تو علاقہ کیوں فتح کیا ہے؟".

حکمران کو اپنی اقلیم میں جو بلند و بالا مرتبہ حیثیت حاصل ہے اس کا بیان محتاج تشریح نہیں. عہد مغلیہ میں اس عہدیدار کو "ظلِ الٰہی" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ آج جب کہ جمہوریت کا بول بالا ہے، اس عہدہ کی وہی قدر و قیمت ہے. حکمران کو ایک مخصوص علاقہ میں اولیت و فوقیت کا تاج پہنایا جاتا ہے۔ اگر جمہور کو ناانصافی کی شکایت پیدا ہو گی تو اس کا مداوا حکمران وقت نہیں کرے گا تو پھر کون کر سکتا ہے؟ پر حکمران کو یہ نکتہ ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ اس کی قلمرو میں جو بھی ظلم ہو گا، وہ اس میں برابر کا حصہ دار تصور کیا جائے گا. اور قیامت کے دن اس کا محاسبہ لازمی ہو گا. یہ دوسری بات ہے کہ عوام اسی دنیا میں اس ظلم کا حساب چکتا کر دیں. حضرت فاروق اعظم فرمایا کرتے تھے "اگر تم لوگ مجھے اپنے معاملات سے آگاہ نہیں کرو گے تو اس کی ذمہ داری تم پر ہے

اور اگر معلوم ہونے کے بعد میں تمہارا حق نہ دلا سکوں تو میں سب سے بڑا ظالم ہوں۔"

اصول جہانبانی میں عدل کو اعلیٰ ترین اہمیت سے نوازا گیا ہے، عدل یہ ہے کہ کوئی کسی کا حق غصب نہ کر سکے۔ طاقتور کمزور پر غالب نہ ہو جائے امیر المومنین حضرت عمرؓ نے عثمان حکومت سنبھالتے ہی جو پہلا خطبہ دیا تھا، اس میں منجلہ اور باتوں کے یہ بھی فرمایا تھا کہ میں ظالم کا ایک رخسار زمین پر رکھ کر اس کے دوسرے رخسار پر اپنا پاؤں رکھ دوں گا، جب تک اس سے دوسروں کا غصب کردہ حق لے نہ لوں اور مظلوم کے سامنے اپنا رخسار زمین پر رکھ دوں گا جبتک کہ اسے اس کا حق دلا نہ سکوں۔ اسی بات کو پہلے خلیفہ الرسول و افضل البشر بعد الانبیا حضرت ابوبکر صدیق اپنے خطبہ اول میں یوں فرما چکے تھے:۔

" میرے نزدیک تمہارا طاقتور ترین شخص کمزور ترین ہے جبتک کہ میں اس سے دوسروں کا غصب کردہ حق لے نہ لوں اور کمزور ترین شخص طاقتور ترین ہے جبتک اسے اس کا حق دلا نہ لوں۔ یہی عدل ہے جو صحیح معنوں میں ایک کامیاب حکومت کا طرۂ امتیاز ہے۔"

کفالت، انصاف کا ہی ذیلی وصف ہے۔ کفالت یہ ہے کہ ہر شخص کو خوراک میسر ہو، کوئی غذا سے محروم نہ رہے۔ فاروق اعظم فرماتے ہیں:۔

" میری مملکت میں اگر کہیں کوئی کتا بھی بھوک سے مر جائے تو

اس کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہو گی"۔ ایک بار حسب معمول کھانا کھا رہے تھے. کسی صاحب نے کہا" امیرالمومنین آپ پر ساری مملکت کی ذمہ داری ہے۔ اپنی صحت کا خیال رکھا کیجئے۔ اچھا کھائیے. اچھا پہنئے"۔ فرمایا۔" اگر تم دو چار آدمی میرے ساتھ کسی سفر پر جاؤ اور اپنے پیسے میرے پاس جمع کرادو اور میرے ذمہ یہ کام لگاؤ کہ راستہ میں خوراک اور رہائش کا بندوبست میں کروں پھر کیا تم یہ بات پسند کرو گے کہ میں تمہارے لئے معمولی کھانے کا انتظام کروں یا اپنے لئے رہائش کا اعلیٰ انتظام کروں اور تمہارے لئے معمولی"۔

دوستی

دوستی انسان کی وہ صفت ہے جو اس کی انفرادیت کو اجتماعیت میں تحلیل و مدغم کر دیتی ہے۔ یہ وہ اکسیر ہے جس سے غم خوشی میں بدل جاتا ہے یہ ایسا ہتھیار ہے جس کے آگے نفرت کی آگ ٹھنڈی پڑ جاتی ہے۔ حضرت پیرِ پیران سید عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں۔

"جس شخص کے دل میں ایمان کی حرارت ہے وہ ایمان والے کو دوست رکھتا ہے اور جس کے دل میں نفاق کا شعلہ ہے وہ ایماندار سے نفرت رکھتا ہے"۔

اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض مردم بیزار لوگ ہر شخص کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ احساس کمتری کے شکار ہو کر دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر کس و ناکس سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ دوستی تو کجا، وہ دوسروں کے دکھ سکھ میں شرکت کرنا اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کو کسر شان سمجھتے ہیں۔

اس طرح کے لوگ یقیناً سماج کی حقارت کے مرتکب بن جاتے ہیں

دوستی انسانی میلان طبع کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ہر شخص اپنی طبیعت اور اپنی تربیت کے مطابق ماحول اور افراد کی تلاش کر لیتا ہے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کرے جو اس کے مزاج اس کے معیار اور اس کے انداز فکر کی ترازو پر پورا اترتے ہوں۔

دوستی اور صحبت کا اثر ہر شخص کی زندگی پر پڑتا ہے اگر وہ اچھوں کے درمیان اٹھتا بیٹھتا ہے تو اس کی شخصیت کے نشوونما میں بھی اچھا اثر پڑے گا اور اگر برے لوگوں سے اس کا واسطہ ہے تو دوست کو چاہئے کہ اپنے دوست کے ساتھ ایسا سلوک کرے جس کی وہ اپنے لئے توقع کرتا ہے۔ ہمیشہ اس کا خیر اندیش رہے۔ اس کے حقوق کی حفاظت کرے خطرے اور درماندگی کی حالت میں اس کی دست گیری کرے۔ اور مصیبت میں کام آئے۔

دوستی کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ اول حقیقی دوم مصنوعی۔ حقیقی دوستی کا ستون مضبوط اور پائیدار ہوتا ہے جبکہ مصنوعی دوستی کی بنیاد کمزور ہوتی ہے۔ پہلی دوستی میں خلوص اور بے لوثی ہو گی جبکہ دوسری دوستی میں مکاری اور خود غرضی دونوں میں بعد المشرقین ہوتا ہے۔ بعض لوگ مصنوعی دوستی کو ڈپلومیسی اور موقع شناسی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اسے درست قرار دیتے ہیں۔ دوستی ایسا پاک جذبہ ہے جس کی نفی کر کے انسان کو حقیقی سکون نہیں مل سکتا۔

ترقی اور رواداری ایسے ستون ہیں جن پر دوستی کی عمارت

کھڑی کی جاتی ہے۔ اس کے باعث انسان اپنے ساتھیوں اور ہم نفسوں میں مقبول ہو جاتا ہے۔ اسی مقبولیت کا دوسرا نام دوستی ہے۔ نرمی دوری ختم کرتی ہے جبکہ غصّہ سے انسان اور انسان کے درمیان دیوار کھڑی ہو جاتی ہے۔ کارنیگی کا قول ہے کہ اگر آپ پُرمسرت زندگی گذارنے کے خواہش مند ہیں تو اپنے دوستوں کا حلقہ وسیع بناؤ۔ انسان کی زندگی کا سب سے نازک مرحلہ وہ ہوتا ہے جب اسے غصّہ آجائے۔ انسان اگر غصّہ میں نہیں ہے اور کسی کو معاف کر دیتا ہے تو یہ اچھا فعل ہے ایک حکایت کا مضمون کچھ اس طرح ہے:۔

"ایک مرتبہ آنکھوں نے زبان سے پوچھا تجھ کو ہر طرف سے دشمن گھیرے ہوئے ہیں اور دانتوں کی چھری ہر وقت تجھ پر تیز رہتی ہے تو اپنے بچاؤ کی کیا تدبیر کرتی ہے؟

زبان نے کہا۔ "نرمی"۔

شری رام چندر

بھگوت گیتا کا ایک قول ہے کہ جب دنیا میں سچائی کا زوال ہونے لگتا ہے تو بھگوان ہی بندوں میں جنم لیتا ہے اور کفر چھٹنے لگتا ہے۔ ہندو فلسفہ کا خیال ہے کہ "مریادا پرشوتم" شری رام چندر بھی ایسی ہی ایک شخصیت تھے جنہوں نے اپنے عہد کی جہالت دور کرنے اور بندوں کو سچی راہ پر گامزن کرنے کیلئے انسان کی شکل میں نزول فرمایا اور اپنے کردار و عمل سے ایک ایسی قابل تقلید مثال قائم کی جس کو آج بھی صدیوں کے گذرنے کے باوجود بھلایا نہیں جا سکتا۔

شری رام چندر کے کردار کو سب سے پہلے رشی بالمیکی نے پیش کیا لیکن اس کو جس خوبصورتی کے ساتھ تلسی داس جی نے "رام چرت مانس" نامی کتاب میں اُجاگر کیا ہے۔ اس کی تعریف کے لئے الفاظ کافی نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنے منظوم شہ پارہ میں اس عظیم المرتبت شخصیت کو "بھگوان کا اوتار" بنا کر دکھایا ہے۔ نظم کے پیراہن نے اس کو لافانی کردار بنا دیا ہے۔ اس مسلسل نظم میں نفسیات نگاری، جذبات نگاری، مرقع نگاری اور ادبی چاشنی کے ساتھ ساتھ واقعات نگاری بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ معاصرانہ حالات کے انعکاس

نے اس نظم کو زیادہ موثر اور دلچسپ بنا دیا ہے۔

بزرگوں کا احترام، استاد کی عظمت، پاسداری قول، عفو و درگذر شفقت و محبت، بے غرضی و خلوص نیتی، جمہوریت و سوشلزم، قوت ارادی اولعزمی، دیانت و امانت، ہمدردی و مساوات، صلہ رحمی و نرمی اور فیاضی و حوصلگی ایسے جذبات ہیں جن کا کسی فرد خاص میں ہونا نہایت ناممکنات میں ہے لیکن یہ رام چندر کی ہمہ پہلو شخصیت تھی جس میں یہ ساری خوبیاں موجود تھیں۔ کیکئی کی بے جا ہٹ دھرمی کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا ان کی عالی حوصلگی کی دلالت کرتا ہے۔ یہاں انہوں نے بیک وقت اپنے والدین کو ان کے حلقۂ تلامذہ میں شامل کرنے کی اجازت دی جائے۔ حالانکہ رام اور لکشمن اپنے والد کے چہیتے بیٹے تھے تاہم وشوامتر کی بات کو ٹال نہ سکے اور دونوں کو ان کے حوالے کر دیا۔

اسی دوران میں وشوامتر کی کٹیا کے نزدیک سیتا جی اتفاق سے اپنی سہیلیوں کے ساتھ چلی آتی ہیں۔ جہاں رام چندر کی نگاہ ان پڑتی ہے۔ دونوں ایک ہی نگاہ میں ایک دوسرے کو پسند کر لیتے ہیں لیکن رام چندر جی کو معلوم ہوتا ہے کہ سیتا جی صرف اسی شخص سے شادی کر سکتی ہیں۔ جو انکے پتا جی جنک کے دھنش کو توڑ دے۔ سوئمبر کی اس تقریب میں دونوں بھائیوں کو بھی بلایا جاتا ہے اس محفل میں بڑے بڑے راجہ اور جاگیر دار موجود ہیں۔ اور ہر ایک دھنش کو توڑنے کی کوشش میں لگا ہے۔ سیتا جی بھی اس موقع پر موجود ہیں۔ تمام راجوں کی ناکامی کے ۔۔۔ بعد راجہ جنک ایک بار پھر

اعلان کرتے ہیں کہ جو شخص اس دھنش کو توڑیگا. میری بیٹی اس کو جے مالا پہنائے گی. رام چندر جی اس دھنش کو توڑ کر سیتا جی سے شادی کر لیتے ہیں.

بڑھاپے میں ہر بوڑھے کو خدا سے لو لگانے کی فکر ہوتی ہے. چنانچہ راجہ دشرتھ نے یہاں یہ سوچا کہ اب گدی رام چندر کے حوالہ کی جائے. اسی مقصد کے لئے تاجپوشی کی تقریب کا اعلان ہوا لیکن رام کی سوتیلی ماں کیکئی اس موقع پر وچن مانگ کر رنگ میں بھنگ کر دیتی ہے، وہ راجہ سے کہتی ہے کہ راج گدی وچن کے. اس کے لڑکے بھرت کو دی جائے. اور رام د لکشمن کو ۱۴ سال کے لئے جلاوطن کر دیا جائے. بس پھر کیا تھا راجہ دشرتھ کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور طوعاً و کرہاً" کیکئی کی بات مان لی. یہ ایثار و قربانی اور بڑوں کے ادب کی بہترین مثال ہے. اگر گہرائی کے ساتھ شری رام چندر کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں ان کا کردار ہر اعتبار سے لائق تقلید پرکشش اور قابل فخر دکھائی دیتا ہے.

سچائی

بھگوت گیتا کا قول ہے کہ سچائی سب سے بڑا دھرم ہے۔ یہ صفت دنیا کی تمام تعلیمات، مذاہب، کردار و گفتار کا لازمی جز بن چکی ہے جو شخص اس پر عمل پیرا ہوتا ہے وہ آخرت کی کھیتی کو سیراب کرتا ہے حضور اکرمؐ نے ارشاد فرمایا کہ جو سچ بولتا ہے خدا اس کو صدیقین میں شمار کرتا ہے اور جو جھوٹ بولتا ہے اس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ کاذبین (جھوٹوں) میں لکھ دیا جاتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سچ بولنے کی قوت ہمیں کیسے حاصل ہوتی ہے؟ موٹے طور پر سچائی کے لئے ارادے، صلاحیت اور محنت کی ضرورت پڑجاتی ہے۔ عام لوگ سچ بولنے کے لئے ارادہ کی ضرورت سمجھتے ہیں لیکن صلاحیت اور کوشش کے بغیر غیر ارادی طور پر انسان جھوٹ بول دیتا ہے اور ایسی حالت میں اس کا بیان سراسر غلط ہوگا۔ ہم نے خود ایک بستر مرگ پر پڑے ہوئے بیمار شخص کو یہی بیان کیا تھا کہ وہ معمولی سا بیمار ہے اور لوگوں سے ایسا ہی بیان کرتے رہے۔ مگر جب کچھ دنوں کے بعد اس بیمار کی موت ہو گئی، تو لوگوں نے ہم سے کہا: واہ صاحب آپ بھی خوب بے پر کی اڑاتے ہیں۔

سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے درست ہی کہا تھا کہ حق نہایت زبردست مددگار اور جھوٹ بہت ہی کمزور معاون ہے۔ جھوٹ بولنے والے سے پرہیز کرو اس لئے کہ وہ قریب ترین شخص کو دور کرتا ہے اور دور کو قریب دکھا دیتا ہے۔ حضرت امام حسنؓ فرماتے ہیں کہ مکارم اخلاق دس ہیں۔

(۱) زبان کی سچائی (۲) جنگ کے وقت حملہ کی شدت (۳) سائل کو دینا۔
(۴) حسن وخلق (۵) احسان کا بدلہ احسان سے دینا (۶) صلہ رحمی (۷) پڑوسی کی حفاظت وحمایت (۸) حق دار کی حق شناسی (۹) مہمان نوازی۔
(۱۰) ان سب سے بڑھ کر شرم وحیا۔

حق گوئی فرض شناسی کی روح ہے۔ اگر لوگ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر اپنی نکتہ چینی کریں تو ان کو اپنی ذات میں ہی خرابیاں نظر آئیں گی اور صبر رخصت ہو جاتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ اگر لوگوں کے عیوب ان کی پیشانیوں پر لکھے ہوتے تو دنیا میں ایڑیوں تک ٹوپی پہننے کا رواج ہوتا۔

جھوٹ کی مختلف قسمیں ہیں۔ مبالغہ، غلو، تحریف، غیبت چغلی اور خاموشی۔ جب آپ کے نہ بولنے سے کوئی ایسی بات سمجھے جو کہ جھوٹ ہے۔ تو اس وقت آپ کی خاموشی بھی جھوٹ کے مترادف کہلائے گی۔ جان بوجھ کر ایسا وعدہ کرنا کہ جس کو پورا نہ کیا جا سکے جھوٹ شمار ہوگا۔

کچھ لوگ سوچتے ہیں کہ کاروبار چلانے میں جھوٹ بولنا ہی پڑتا ہے یہ بالکل جزوی طور پر صحیح نہیں ہے۔ جو لوگ عمدہ سودا فروخت کرتے ہیں اور کھرے دام وصول کرتے ہیں۔ لوگ تھوڑے ہی دنوں میں ان کے سودے کو عمدہ سمجھ کر دوسروں کے مقابلہ میں ان کی چیزیں خریدنا پسند کرتے ہیں۔ غیر ملکی سامان خواہ جعلی اور ناپائیدار ہی کیوں نہ ہو مگر دیسی مال کے مقابلہ میں اس کا خریدنا فیشن بن گئی ہے۔

یورپ میں کیویکر شنام کی انجمن کا مقصد سچ بولنا ہے یہ لوگ تو سچائی کی انتہا کے قائل ہوتے ہیں۔ وہ ادب کو قطعی ناپسند کرتے ہیں کیوں کہ اس میں مبالغہ آرائی سے کام لیا جاتا ہے۔ اس کے ممبران لفظ "جناب" کا استعمال بھی نہیں کرتے اگر ان سے اس کا سبب دریافت کیا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم کو Knighthood کا خطاب نہیں ملا ہے۔ جو لفظ "جناب" استعمال کریں۔ اس کے ممبران بازار میں اشیا کی خریداری کے وقت مول تول بھی نہیں کرتے۔ وہ دوکاندار سے صرف ایک مرتبہ ہی بھاؤ پوچھتے ہیں اگر ان کو پہلی دفعہ میں قیمت درست معلوم ہوتی ہے تو خرید لیا کرتے ہیں۔ ورنہ یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ مجھ کو یہ قیمت زیادہ لگتی ہے اگر دوکاندار انہیں پھر بلا کر اسی چیز کے دام کچھ گھٹا کر بتائے تو وہ اس کی بات نہیں سنیں گے اور یہی کہہ دیں گے کہ تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟ اور پھر آئندہ اس کی دوکان پر کبھی نہ آئے گی"

ایک نوجوان چوری کے الزام میں حضرت عمرؓ کے روبرو پیش

کیا گیا۔ تصدیق و تحقیق کے بعد شریعت کے مطابق آپؓ نے اس کے ہاتھ کاٹے جانے کا حکم فرما دیا۔ نوجوان نے نہایت عجز و انکساری کے ساتھ معافی تلافی کرنا چاہی اور کہا کہ یہ میری پہلی چوری ہے۔ آئندہ میں ہرگز چوری نہ کروں گا۔ آپؓ نے فرمایا تم غلط کہتے ہو، اس سے پہلے تم نے متعدد مرتبہ چوری کی ہے۔ مجرم نے بار بار انکار کیا لیکن آپؓ نے بار بار یہی اصرار کیا کہ تم نے پہلے بھی چوریاں کی ہیں۔ بالآخر مجرم کو اقرار جرم کرنا ہی پڑا لیکن مجرم نے اب معافی طلب کرنے کی بجائے محض یہ دریافت کیا کہ امیر المومنین ان چوریوں کا علم سوائے میرے اور خدا کے کسی کو نہیں تھا لیکن آپ پر یہ حقیقت پوشیدہ طرح ظاہر منکشف ہو گئی؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ خداوند کریم کسی شخص کو اس وقت تک ذلیل اور رسوا نہیں کرتے جب تک اس کی برائی حد سے نہ گذر جائے۔

ظلم اور ریاکاری

ایک ہی سکے کے دو رخ

ریاکار اور ظالم دنیا کا وہ بدترین شخص ہے جس کی طبیعت میں چھل کپٹ، فریب تصنع اور دھوکا ہوتا ہے جس کی عقل پر ظلمتوں اور بدگندگی کے پردے پڑے ہوتے ہیں۔ اور جس کے اعمال پر رذالت کی چھاپ ہوتی ہے ظلم اور ریاکاری ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں اور ان کا ساتھ چولی دامن کا ساتھ کہلاتا ہے جو شخص ریاکاری کا خوگر ہوتا ہے وہ یقیناً ظلم کے پھندے میں گرفتار نظر آئے گا۔ عبدالقادر جیلانی رح نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:

"اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پاک کے دشمنو! بندگانِ خدا پر ظلم کرنے والو! تم ظلم اور نفاق ظاہر ہیں ہو یہ ریاکاری کب تک جاری رہے گی۔"

وہ آگے فرماتے ہیں۔

"عالمو، زاہدو! تم بادشاہوں اور امیروں سے تعلق رکھنا چاہتے

ہوتا کہ ان سے دنیا کا مال و متاع اور اس کی لذتوں کا لطف اٹھاؤ۔ تم اور اس زمانہ کے اکثر بادشاہ اللہ تعالیٰ کے مال میں" جو کہ اس کے بندوں کے لیے ہے خیانت کرتے ہو۔ اے اللہ! ریاکاروں کے دبدبے کو توڑ دے اور انہیں رسوا کر دے یا ان سے توبہ کرا دے۔ اے اللہ! ظالموں کو برباد کر اور زمین کو ان سے پاک کر یا پھر ان کی اصلاح کر دے"۔

ریاکاری انسان کو اندھا بنا دیتی ہے۔ ریاکار جو باتیں کہتا ہے ان کو عملی زندگی میں نہیں اپناتا وہ دوسروں کو نصیحت اور خود کو فضیحت کا قائل ہوتا ہے۔ اللہ پاک قیامت کے دن سب سے پہلے ایسے ریاکاروں اور منافقین اور بے عمل عالموں کو ہی سزا دے گا جنہوں نے زندگی بھر دوسروں کو نیک راہ پر گامزن ہونے کی تلقین تو کی لیکن خود اس راہ سے بھٹک گئے۔

جو شخص ریاکار ہوتا ہے وہ خود کو بے حد عقلمند، ذہین اور شاطر سمجھتا ہے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ وہ خود فریبی میں مبتلا رہتا ہے۔ وہ اپنے ہی بُنے ہوئے جالوں میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ اس کا ضمیر خود اس کو ملامت کرنے لگتا ہے۔

... ضمیر اصل انسان کی نفسیاتی کیفیت کا وہ زندہ احساس ہے جس کے ذریعہ وہ نیک و بد میں تمیز کر سکتا ہے۔ اور جس کے سبب اس کے دل میں اندر سے خود بخود نیکی کی آواز اٹھتی ہے۔

ایک شخص نہایت نفیس کپڑے پہن کر آیا لیکن جب بات کرتا تو غلط اور بے محاورہ بولتا۔ فیثاغورث نے کہا۔ یا تو تم اپنی گفتگو کو ایسا کرو جیسا تمہارا لباس ہے، یا ایسا لباس پہنو جیسی تمہاری گفتگو ہے

ذوق فرماتے ہیں ؎

عیبِ ذاتی کو چھپائے گا نہ وصفِ عارضی
زیبِ بد اندام کو ذوقؔ کیا پوشاک سے

بہاؤ الدین عاملی کا قول ہے کہ انسان کی عقل دین سے، اس کا قول فعل سے اور اس کا لباس اس کی قدر و منزلت سے نیچے رہے تو زیادہ بہتر ہے۔

غصّہ

غصہ ایک قسم کا جنون ہے جو انسان کے حواس پر غالب آجائے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے .... اور غصہ کی حالت میں اس کو نیک و بد کی تمیز نہیں رہتی۔ غصے کا انجام ہمیشہ پشیمانی ہے اور اس پشیمانی سے روح کو سخت صدمہ ہوتا ہے۔ اسی لئے غصہ کا پی جانا ہی مصلحت اندیشی ہے۔

بھگوت گیتا میں ارشاد ہوا :- "اگر تم میں عفو و درگذر کا مادہ ہے تو کسی ضرورت کی ضرورت نہیں، اگر تم میں غصہ موجود ہے تو اس سے بڑا کوئی دشمن نہیں۔ اگر تم میں اخوت کا جذبہ ہے تو پھر کوئی چیز حتیٰ کہ آگ بھی تم کو ضرر نہیں پہونچا سکتی"۔

چانکیہ کہتا ہے کہ جو شخص خوشحالی حاصل کرنا چاہتا ہے اس کو زیادہ سونا، بیکاری، خوف، غصہ اور سہل انگاری چھوڑ دینی چاہئے"۔

بھگوت گیتا نے کیا خوب کہا ہے کہ غصہ سے وہم پیدا ہوتا ہے اور وہم حافظہ کو کمزور بنا دیتا ہے۔ غصہ کی حالت میں ہم کسی دوسرے کو اپنا شکار بنانے سے گریز نہیں کرتے ذرا سا معاملہ ہو اور جو بھی ہمارے سامنے

پڑجائے تو ہم اس پر غصہ اتار دیتے ہیں۔

جس طرح سے آندھی میں بگولہ اپنی تندی سے درختوں کو توڑتا اور گراتا ہے اور فطری ہیت کو بگاڑتا ہے یا زلزلہ اپنی لرزش سے شہر کے شہر تہہ و بالا کر ڈالتا ہے، اسی طرح سے غصہ ور آدمی کا طیش و غضب اس کے گرد قیامت برپا کر دیتا ہیں۔ خطرے اور خرابیاں اس کے قریب تر آجاتے ہیں۔ نظام الملک طوسی کا خیال ہے کہ بدخلق وہ ہے جو کہ غصہ کی حالت میں اپنے نفس کا مالک نہ رہے۔ بزرجمہر کہتا ہے کہ میں انگاروں پر چلا اور گرم ریت کو پامال کیا مگر میں نے غصہ سے زیادہ گرم آج تک کوئی چیز نہیں دیکھی۔ ہوشنگ کا خیال ہے کہ انسان کی عقل کا اندازہ غصہ کی حالت میں لگانا چاہیئے۔ حضرت سلیمان ارشاد فرماتے ہیں کہ ملائم جواب غصہ کو ٹھنڈا کر دیتا ہے جبکہ کرختگی لہجہ آدمی کے غضب و غصہ میں افزائش کر دیتی ہے جس کو غصہ دیر میں آتا ہے وہ بہت ہی عقلمند ہے اور جو زود مزاج ہوتا ہے اپنی بے وقوفی کا اظہار کر دیتا ہے۔

غصہ انسانی اعصاب کی اس کیفیت کا نام ہے جس سے آدمی کا ذہن اور جسم دونوں متاثر ہوتے ہیں قرآن مجید میں صاف طور پر اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ غصہ پی جانے والے اور معاف کر دینے والے اللہ کے دوست ہیں۔ غصہ ایمان کو اس طرح خراب کر دیتا ہے جس طرح ایلوا شہد کو امر واقعہ یہ ہے کہ انسانیت کی پرکھ غصہ کی حالت میں کی جاسکتی ہے حضرت عمر فرماتے ہیں کہ کسی شخص کے اخلاق و عادات پر اس

وقت تک بھروسہ نہ کرو جبتک کہ اسے غصہ کے وقت آزمانہ لو۔ افلاطون کی نظر میں غصہ کا جواز موجود ہے لیکن اس نے توازن و معیار کی شرط لگائی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ غصہ اگر برمحل ہے تب بھی اسے ایک حد کے اندر رہنا چاہئے جیسے کھانے میں نمک۔

غصہ کی حالت میں تلی سکڑ جاتی ہے معدہ کا تشنج ہو جاتا ہے، آنتوں میں اینٹھن ہونے لگتی ہے۔ حرکت قلب تیز ہو جاتی ہے اور خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات جوش غضب میں دماغ کی کوئی رگ بھی پھٹ جاتی ہے۔ یا حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث موت واقع ہو سکتی ہے۔ اسی لئے ایک عربی کہاوت المس جنونی کیفیت کا پورا احاطہ کرتی ہے "غصہ کا آغاز جنون ہے اور انجام ندامت"۔

بھگت کبیر ایک صوفی منش شاعر تھے وہ اپنے ایک دوہے میں مردِ حق کی تعریف کرتے ہوئے غصّہ کی خصوصیت بیان کرتے ہیں۔ دوہے کا لفس مضمون یہ ہے کہ گالی انگارہ ہے، غصہ بھڑکتا ہوا شعلہ اور غیبت دھواں ہے۔ جو ان برائیوں کو چھوڑ دے وہی مردِ حق ہے۔

داتا گنج بخش فرماتے ہیں کہ غصہ عقل کو کھا جاتا ہے جبکہ حضرت عثمان نے اس بیماری کا علاج بھی تجویز کر دیا ان کا خیال ہے کہ خاموشی غصہ کا بہترین علاج ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاء

کا ارشاد عالیہ یہ ہے کہ غصہ کے پی جانے سے معاف کر دینا بہتر ہے کیوں کہ جو شخص غصّہ پی جائے اور صاف نہ کرے تو ممکن اس کے دل میں کینہ پیدا ہو جائے جو دل کی بہت بڑی بیماری ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ غصہ کا محرک۔ انسان کی جسمانی ساخت ذہنی پریشانیاں اور گردوپیش کے حالات ہوتے ہیں۔ بقول حضرت علیؓ غصہ ایک طرح کا جنون ہے۔ کیوں کہ غصہ کرنے کے بعد آدمی کو نادم ہونا پڑتا ہے۔ اگر نادم نہیں ہوتا تو اس کا جنون مستحکم ہے غصہ کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے۔ لیکن اس کا ہر سبب عموماً اچھا نہیں ہوتا اس سے احساسِ کمتری کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ اور اپنی ذات سے انتقام لینے کا شدید جذبہ بھی۔

گوسوامی تلسی داس بیان کرتے ہیں کہ جہاں غصہ ہے وہاں تباہی ضرور ہوگی۔

مہاتما بدھ کا قول ہے کہ جس طرح کھولتے پانی میں اپنا عکس دکھائی نہیں دیتا۔ اسی طرح انسان غصّہ میں یہ نہیں سمجھتا کہ اس کی بھلائی کس میں ہے۔

جب غصہ کی لہر ایک بار آپ کو چھو جاتی ہے تو قطعی جبلی طور پر آپ پر اثرات مرتب ہوتے ہیں، نفرت بغض اور عناد، غصہ اور غیظ و غضب کی گٹھڑی ہوئی کچھ جامد شکلیں ہیں۔ نفرت دراصل غصہ سے بہت مختلف چیز ہے لیکن غصہ کا ہر اظہار اسمیں پس پردہ جھلکتا ہوا نظر آنے لگتا ہے

رفاقت

ایک کامیاب زندگی کے لئے تین چیزیں نہایت ضروری سمجھی گئی ہیں۔ صحت، دولت اور عقل۔ ان میں ایک چوتھی چیز کا اضافہ کیا جاسکتا ہے، وہ ہے دوستی! اگر اس بات کو مبالغہ پر محمول نہ کیا جائے تو ایک کامیاب دوستی کو پہلے درجہ میں رکھا جاسکتا ہے جس شخص کو اچھے دوست میسر نہیں تو پھر وہ دولت، صحت اور عقل کے ہوتے ہوئے بھی اپنی زندگی کا پورا لطف حاصل نہیں کر سکتا۔

بعض لوگوں کو ہم قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن محبت نہیں کرتے بعض کے ساتھ الفت کرتے ہیں مگر ان کی قدر نہیں کرتے۔ مگر سچی دوستی کے لئے لازم ہے کہ دونوں باتیں ہوں یعنی قدر بھی کریں اور محبت بھی لیکن یہ بھی فطری حقیقت ہے کہ تمام افراد سے محبت کرنے کے باوجود سب سے دوستی نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے ہمیں انتخاب کرنا چاہئے۔ کہتے ہیں کہ رقیبوں اور حریفوں یعنی ہم پیشہ لوگوں کے درمیان سچی دوستی نہیں ہو سکتی ان میں رقابت اور رشک کا جذبہ بھی کارفرما رہتا ہے اور وہ دونوں فریقین میں دوری اور فاصلے پیدا کر دیتا ہے۔

صحت وراثتی عطیہ ہے۔ دولت اور عقل بھی موروثی اور اکتسابی صفات میں شامل ہیں۔ لیکن دوستی ایسی ہے جو کسی شخص کو وراثت کے طور پر حاصل نہیں ہوسکتی۔ یہ قدرت کی طرف سے تحفہ یا خیرات کی شکل میں تقسیم نہیں ہوتی بلکہ دوستی ایک فن ہے جس کو مشق اور تجربہ کے ذریعہ کمانا پڑتا ہے اس فن کے لئے انسان کو ایثار، صبر، حلم، درگذر، خطاپوشی اور خوش خلقی کی خوبیوں سے متصف ہونا ضروری ہے۔ دوستی کے لئے پہلی لازمی شرط یہ ہے کہ اپنے آپ کو برتری، انانیت اور تکبر سے بچائیے۔ اپنے آپ کو کامل نہ سمجھئے۔

دوستی کسی معاہدہ کا نام نہیں اور نہ ہی معاہدہ کی دوستی کو کبھی کامیاب دیکھا گیا ہے۔ دوستی جتنی گہری ہوگی، امیدیں بھی اتنی ہی زیادہ ہوتی ہیں۔ دوست جو صرف تمہاری اچھی حالت کا دوست ہو اور آڑے وقت پر کام نہ آسکے، اس سے اجتناب کرنا بہتر ہے کیوں کہ وہ اصل میں سب سے بڑا دشمن ہے۔

سچی دوستی کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ایک دوست دوسرے دوست کے نقائص کی طرف صاف گوئی سے نشان دہی کرتا رہے۔ کیوں کہ اپنی برائیوں کی طرف نگاہ کرنا ہر آدمی کے بس کا کام نہیں ہوتا۔ ایک شخص اپنے فلسفی دوست کو امیر سے ملوانے لے گیا۔ امیر کی نیک نفسی اور داد ودہش کا بڑا شہرہ تھا فلسفی دوست امیر سے مل کر بہت خوش ہوا۔ اس نے ایک گھنٹہ کی ملاقات میں یہی دیکھا کہ

حاجت مند آتے ہیں اور کچھ نہ کچھ لے کر واپس ہو جاتے ہیں۔ فلسفی نے امیر سے کہا: "یہ تو اسراف ہے اگر تم اسی طرح دیتے رہے تو ایک نہ ایک دن تم تہی دست ہو جاؤ گے۔ اور انہیں لوگوں میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہو گے۔"

امیر نے بے نیازی اور استغنا سے جواب دیا۔ "حضرت علیؓ کا قول ہے کہ اگر سردار بننا ہے تو نیکی کرو۔ میں اسی قول پر عمل کر رہا ہوں۔"

"سردار تو تم پہلے ہی سے ہو اب تم فقیری کی طرف مراجعت کر رہے ہو"!

امیر کو یہ بات بُری لگی اس نے اپنے اس مصاحب سے جو اس فلسفی کو لے کر آیا تھا، شکایتاً کہا: "تم کیسے مردم شناس ہو کہ اس کھُرّے اور گستاخ کو اس محفل میں لے آئے ہو۔"

مصاحب نے ابھی کوئی جواب بھی نہ دیا تھا کہ فلسفی بول اٹھا۔

"امیر! میں تمہارا دوست ہوں۔ بدخواہ نہیں تم جس طرح سب کے سامنے لوگوں کی حاجتیں پوری کرتے ہو۔ اس میں بوئے تکبر پائی جاتی ہے اور یہ اس نیک کام کو بھی اغدار کر دیتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر کام میں اعتدال ہونا چاہیئے۔" پھر نہایت عالمانہ انداز میں پوری بات کہدی۔

"میں اس نکتہ سے اچھی طرح واقف ہوں کہ اگر دوست اپنے دوست کا عیب چھپائے تو یہ خیانت ہو گی۔ اور اگر اس عیب کو دوسروں کے سامنے بیان کرے تو غیبت اور میں ان دونوں برائیوں سے بچتا

چاہتا ہوں"

یوں تو بظاہر ہر نئی شے عمدہ اور دلفریب لگتی ہے لیکن دوستی جتنی پرانی ہوتی ہے اتنی ہی مضبوط اور بہتر ہوتی ہے۔ دشمن سے ایک بار تو دوست سے ہزار مرتبہ ڈرنا چاہئے کیونکہ دوست اگر دشمن ہو جائے تو اسے گزند پہنچانے کے طریقے معلوم ہوتے ہیں۔ قاضی ابن معروف علقمہ عطاوی نے انتقال کے وقت اپنے فرزند کو نصیحت فرمائی کہ بیٹا ایسے شخص کو دوست بنانا جو تیرے مال و آبرو کا محافظ ہو، جو وقت پڑنے پر تیری مدد کر سکے، جو تیری نیکیوں کا اظہار کرے اور نیکی کا بدلہ نیکی سے دے اور جو تیری عزت اور آبرو کا خواہاں ہو

عبداللہ انصاری فرماتے ہیں کہ ہزار دوست کم ہیں اور ایک دشمن بہت ہے۔ حضرت علی کا قول ہے کہ سچا دوست وہ ہے جو تیرا ساتھ دے۔ جو تیرے فائدے کے لئے اپنا نقصان اٹھائے اور اگر زمانہ سے تجھے کوئی صدمہ پہنچے تو وہ تیری دل جمعی کی خاطر ہر قسم کی پریشانی اٹھائے۔

انانیت

انانیت، انسانی فطرت کا وہ جذبہ ہے جس کے سہارے ایک شخص اپنے وجود کو داخلیت کے حصار میں بند کر لیتا ہے اور پھر وہ دوسرے لوگوں کو کم تر سمجھنے لگتا ہے۔ وہ اپنی قوتوں پر غلط انداز سے اعتماد کرنے کو عقلی زاویۂ نگاہ سے بُرا خیال نہیں کرتا۔ اس کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے اور وہ ایک کھلی ہوئی فضا میں سوچنے اور دیکھنے کو باعث حقارت سمجھنے لگتا ہے۔ درحقیقت اعتماد کی زیادتی بھی ایک منفی اور خطرناک رجحانِ طبع ہے اور اس کو احمقانہ فعل سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس فعل کو بعض لوگ زعم باطل کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔ کسی شخص کا اپنی فطری قوتوں پر بیجا اعتماد کرنا اور جوہر ذاتی کو محض ضرورت پڑنے پر مفید تصور کرنا، حالات بیرونی سے پہلو تہی کرنا اور صحیح خیالات کا غلط اندازہ کرنا، عملی زندگی میں حماقت کے سوا کچھ نہیں ہے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ تین باتیں

ہلاکت میں ڈالنے والی ہیں۔

(۱) ایسی خواہش جس کا انسان طابع اور غلام بن کر رہ جائے۔

(۲) ایسی حرص جسے مقدر اور پیشوا مان لیا جائے۔

(۳) خود پسندی یعنی انانیت

حضور نے فرمایا یہ تینوں میں زیادہ خطرناک ہے انسان کا اپنے علم، دولت جسمانی توانائی یا کثرت زہد و تقویٰ پر اترانا ایک اخلاقی مرض ہے کہ جس میں مبتلا ہو کر انسان اس طرح خود فریبی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ نہ تو وہ اپنی غلطی پر نادم ہوتا ہے اور نہ ہی اس میں تلاش حق کے لئے کوئی تڑپ باقی رہتی ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ سلاطینِ دوراں نے انانیت کے جذبے میں چور ہو کر پیغمبرانِ الٰہی اور پیشوانِ ملّت کے پیغام حق و صداقت سے سرکشی کرنے سے گریز نہیں کیا اور آخر کار انہیں ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ مدح سرائی اور خود پسندی انسان کی آخری کمزوری ہوتی ہے لیکن رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ جب تم مدح سرائی کرنے والوں کو دیکھو تو ان کے منہ پر خاک جھونک دو۔

ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ انانیت انسان کا داخلی اور انفرادی فعل ہوتا ہے۔ اور اس سے اجتماعیت کو لازماً متاثر ہونا پڑتا ہے۔ انانیت انسان کو ذہنی خلفشار اور قلبی اضطراب سے دوچار کرتی ہے اور وہ معاشرہ سے الگ تھلگ ہو جاتا ہے ایسا انسان خود اپنی

آگ میں جھلس کر رہ جاتا ہے۔ اس کو "میں" کا جذبہ تباہی کے دہانے پر لا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ جب کوئی انسان انا میں اور "میری" کے احساس میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کو حقیقتاً فریب کی خاک اور زہر کے سوا کچھ نہیں مل پاتا۔ گورونانک جی نے بالکل درست فرمایا ہے کہ جب کسی انسان کو اپنے اندر کی "انا" کا احساس ہو جائے تو وہ سمجھ لیتا ہے کہ نجات کا دروازہ کدھر ہے؟ کسی پر بہتان نہ لگاؤ۔ کسی کو مت اکساؤ، کیوں کہ جو انانیت پسند اس طرح کرتا ہے تو وہ اصل میں آنکھوں کا اندھا اور بے وقوف ہے۔

انانیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انسان اس جذبے سے مغلوب ہو کر نہ صرف اپنے آپ کو نقصان کی دعوت دیتا ہے بلکہ وہ اپنے گرد و نواح کے ماحول کو بھی زبردست خطرہ پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے عزیز و اقارب، اس کے احباب اور اس کے خیر خواہوں میں بھی بد گمانیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور اس کی اخلاقی خوبیوں پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ وہ سماج میں غیر مقبول ہونے لگتا ہے وہ کھلی فضا میں سانس نہیں لے سکتا۔ جمہوری نظام حکومت میں جہاں ہر شخص کو اپنے خیالات اور صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے مساویانہ حقوق حاصل ہوتے ہیں وہاں کسی شخص کا انانیت پہ تکیہ کرنا اس کو ذلت و خواری کے سوا اور کیا دے سکتا ہے؟

اگر بغور دیکھا جائے تو ہم اس نتیجہ پہ پہونچتے ہیں کہ دل جس

سمت میں رہنمائی کرتا ہے جسم اسی سمت میں بڑھتا ہے۔ یہ نفس کبھی نیکی کی طرف لے جاتا ہے جسم بھٹی کی حیثیت رکھتا ہے جس میں نفس کا لوہا ڈھالا جاتا ہے اور پانچ قسم کی آگ سے تپایا جاتا ہے۔ بقول گورونانک جی "گناہوں کے کوئلے تفکرات کے چمٹے سے جمع کئے جاتے ہیں۔ اور دل جلتا ہے۔ 'نفس اور انا' لازم وملزوم چیزیں ہیں۔ اور جب نفس کسی شخص کو اپنی مٹھی میں کر لیتا ہے تو پھر اس سے چھٹکارا پانا نہایت دشوار ہو جاتا ہے لیکن انسان کو اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے۔ اس کو یہ لقب محض یوں ہی عطا نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ قدرت نے اس کو نیک وبد کی تمیز اور قوت فیصلہ کا ادراک دیا ہے۔ دوسرے لوگوں کے وجود کو سمجھنے، پرکھنے اور اس کی قدرومنزلت کیلئے اس کو تاکید کی گئی ہے اگر ایک انسان اپنے معاشرہ کے دوسرے انسانوں کی صفات کو استحسان کی نظر سے نہیں دیکھتا اور انکی ستائش کے لئے "انا" کے پرنالہ کو قابو میں نہیں رکھتا تو پھر معاشرہ ہی بکھر جائے گا اور پھر SURVIVAL OF THE FITTEST کی جنگ چھڑ جائے گی۔ "خوب سے خوب تر" کی تلاش انسانی فرائض میں شامل ہے۔ انانیت سے وہ جاہلیت کا احیا ہو جائے گا وہ تہذیب جس نے ہزاروں سال کا سفر طے کیا ہے ظلمتوں کی ٹھوکر کھا کر پوری انسانیت کو ساتھ لے کر تباہ ہو جائے گی۔

انانیت اور خودی میں مماثلت نہیں ہے بعض دانشوران دونوں چیزوں میں کوئی تفریق نہیں کرتے اور ایک ہی شئے سمجھ بیٹھتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ انانیت خودی کی بدترین شکل ہے جو انسان کو گمراہ کر دیتی ہے۔ خودی انسان کا داخلی وصف ضرور ہے لیکن اس میں اعتدال کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ انسان صحیح سمت میں گامزن رہے اور اسے قلبی سکون کی دولت میسر ہو جائے۔

سرور کائنات کا قول ہے کہ تین چیزیں ہلاکت کا سبب بنتی ہیں۔ اول بخل یعنی خدا اور خلقِ خدا کا حق ادا نہ کرنا، دوم خواہشات نفسانی کا مطیع ہونا اور سوم خود بینی یعنی انانیت۔ حجۃ الاسلام امام غزالی نے بھی فرمایا ہے کہ اپنے تیئں بڑا جاننا بہت بُرا ہے۔ حقیقت میں یہ وصف خدائے پاک کے ساتھ مخصوص ہے کیوں کہ اصل میں بڑائی اس کو سزاوار ہے۔

غرور

دوسروں سے اپنی تعریف سُننا، انسانی سرشت میں ہے معدودے چند لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے مزاج و عمل کے معائب پر احتسابی نگاہ ڈال کر یہ سوچتے ہیں کہ وہ کس طرح اپنی شخصیت میں اعتدال اور بلندی قائم رکھیں اور اپنے اطراف و جوانب میں اپنے اوصاف کی بدولت مقبول ہو سکتے ہیں۔

غرور انسانی فطرت کا وہ جذبہ ہے جو معاشرہ کے بڑے سے بڑے رکن کو اپنی مٹھی میں لے سکتا ہے۔ اور اس برائی کو شکست دینا بے حد مشکل معلوم ہوتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ غرور کے پنجہ سے سلاطین دوران کبھی نہ بچ سکے اور علمائے کبار بھی۔ دانشوروں نے بھی اس کے آگے سر تسلیم خم کیا ہے تو سرمایہ داروں نے بھی جنگجو اور شجاع لوگوں نے اگر میدانِ جنگ میں اپنے زبردست حریفوں کو پچھاڑا ہے تو اس جذبہ کے ہاتھوں انہوں نے بھی شکست کھائی ہے۔ غرور ان کو اندھا بنا دیتا ہے۔ ڈھاک کا

پھول بظاہر کتنا خوبصورت دکھائی دیتا ہے اور بے مصرف ہوتے ہوئے بھی بڑا خوشنما معلوم ہوتا ہے لیکن اس پھول میں خوشبو نہیں ہوتی. مغرور انسان بھی ڈھاک کے پھول کی طرح ہوتا ہے. اس کو اپنے جسم، اپنی عقل، اپنی دولت، اپنے خاندان اور اپنے پیشہ میں سے کسی ایک چیز پر تکیہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ظاہری اسباب اور خارجی معاش کو ہی سب کچھ سمجھنے لگتا ہے لیکن تجربہ نے اور تاریخ نے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ یہ تمام باتیں دلفریب بے بنیاد اور لا یعنی ہیں۔ عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ ایسا شخص جنت میں داخل نہ ہو سکے گا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی غرور ہو گا۔ ایک ولی نے دریافت کیا کہ انسان پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا عمدہ ہو، اس کے جوتے اچھے ہوں تو سرور کائنات نے فرمایا کہ اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے. لیکن تکبرؔ حق کے مقابلے میں اترانے اور اور لوگوں کو حقیر سمجھنے کا خیال ہے۔

غرور ایک اعصابی خرابی ہے۔ اور نفسیاتی پراگندگی بھی غرور ایک اخلاقی نقص بھی اور مذہبی فروگذاشت بھی. مغرور انسان ذہنی علالت میں مبتلا ہو کر ایسے کام کر بیٹھتا ہے جو ہوش مندی میں ہرگز ممکن نہیں ہو سکتے. غرور یوں تو انفرادی قسم کا فعل ہوتا ہے لیکن اس سے فرد اور معاشرہ میں کافی دوری پیدا ہو جاتی ہے انسان کے اس انفرادی عمل کا سماج پر شدید ردعمل ہوتا ہے۔ بعض لوگ اس قدر مغرور ہو جاتے ہیں کہ اس کے باعث وہ کسی دوسرے کی غمناک حالت سننا یا دردوغم

میں شریک ہونے کو کسرِ شان خیال کرتے ہیں۔ ان کی گفتار و رفتار میں غرور و تکبر کی لَے تیز ہو جاتی ہے۔ اور غالباً وہ اس قرآنی آیت کے ترجمے کا بالکل خیال نہیں رکھتے۔

"اور زمین پہ اکڑ کے نہ چلا کرو، کیوں ؟ اس دھماکے کے ساتھ چلنے سے، تو زمین کو پھاڑ نہیں سکے گا۔ اور نہ دتن کر چلنے سے پہاڑوں کی لمبائی کو پہنچ سکے گا۔"

مغرور انسان اپنے عیوب پر نگاہ نہیں رکھتا بلکہ وہ دوسرے کو حقارت سے دیکھ کر اپنے نفس کو آسودگی پہنچاتا رہتا ہے۔ ایسا شخص انصاف اور مساوات کو کبھی اپنے قریب نہیں آنے دیتا۔ اس کا لازمی نتیجہ مایوسی، ذلت اور نفرت کی شکل میں برآمد ہوتا ہے۔ یونان کے کسی رئیس نے ایک ذی علم اور دانش مند غلام پر اپنی سبقت ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ غلام نے کہا کہ اگر آپ کی بزرگی مجھ غلام کی نسبت اس نفیس پوشاک کے سبب سے ہے تو آپ زیب تن کئے ہوئے ہیں۔ اگر آپ مجھ سے اس چالاک گھوڑے کی بدولت لائق عظمت ہیں جس پر آپ سوار ہیں۔ تو خیال فرمائیے کہ نفاست اور چالاکی پوشاک اور گھوڑے میں ہیں نہ کہ آپ کی ذات میں پس اس کا فخر کرنا عبث ہوگا۔ انسان کے لئے لازم آتا ہے کہ وہ اپنے عیوب پر وقتاً فوقتاً نگاہ ڈالتا رہے۔ اور دوسروں کے کمالات کو دیکھتا رہے۔ اگر دوسروں میں صفات نظر آئیں تو ان کی تعریف کرنے میں بخل نہ کرے۔ اپنے عیوب کا پتہ

لگانے کے لئے اس کا فرض ہے کہ وہ دوسروں کو نکتہ چینی کے مواقع فراہم کرے اور اپنی برائیاں سننے کا حوصلہ پیدا کرے۔ مال و متاع اور دولت و ثروت پر غرور کرنا حماقت ہے کیوں کہ داناؤں کا قول ہے کہ دولت ایسی شے ہوتی ہے جو غارت ہونے سے نہیں بچ سکتی۔ چوری اور لوٹ ہر زمانہ میں ہوتی رہتی ہے۔ اب بھی ہوتی ہے اور آئندہ بھی ہوتی رہے گی۔ اس لئے دولت پر غرور کرنا ناعاقبت اندیشی کے سوا کچھ نہیں۔

خوبصورتی اور ظاہری حسن "کانٹے پر کی اوس" کی طرح عارضی اور فانی ہے کہ پڑی اور ڈھل گئی۔ قوت کا غرور بھی حماقت کی دلیل ہے۔ علم کا غرور عاقبت میں اپنے لئے کانٹے بوتا ہے۔ اور اگر غرور خاندان کے اوپر منحصر ہے تو وہ آباؤ اجداد کی شرافت کے اختیار سے ہوگا۔ اسی لئے غرور کی لعنت سے احتراز کرو جو نہ صرف انسان کی ترقی میں رکاوٹ بن جاتا ہے بلکہ معاشرہ سے یہ مول لینے کا سودا کوئی بھی ہوش اور معقول انسان تو کر نہیں سکتا۔ بقول فرینکلن سچ تو یہ ہے کہ غرور کے برابر کوئی نفسانی خواہش ایسی نہیں جس کی اصلاح دشوار ہو۔ کیوں کہ خواہ کوئی کتنا ہی اس سے دور بھاگے اور کتنا ہی دماغ اس کی سیاہی چھپانے کی کوشش کرے پھر بھی یہ لعنت کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی بات پر ظاہر ہو ہی جاتی ہے

انصاف

انصاف ہماری زندگی کا ایک ایسا مطالبہ ہے جو ہر عہد اور ہر معاشرہ میں اپنا جواز اور اپنی اہمیت کا حامل ہے جب ہم اپنے دوستوں اور پڑوسیوں سے ملتے ہیں تو ان سے انصاف کی توقع رکھتے ہیں۔ والدین اپنی اولاد سے اور اولاد اپنے والدین سے انصاف کے طلبگار ہوتے ہیں۔ ماتحت اور حاکم بھی ایک دوسرے سے انصاف چاہتے ہیں۔ اور جب ایک، دوسرے کو اس کی نفی کا احساس ہوتا ہے تو دونوں فریقوں میں بے چینی کا پیدا ہونا کوئی غیر فطری بات نہیں۔

انصاف کی پامالی پر سماج کے ہر فرد پر شدید ردِ عمل ہوتا ہے، احتجاج ایجی ٹیشن، تشدد اور تخریب انصاف کے فقدان کے نتائج اور مظاہر ہیں۔

جس شخص کو انصاف کی دولت نہیں ملتی وہ برہمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور یہ احساس اس کے اعصاب کو متاثر کر دیتا ہے۔

کبھی کبھی تو ایسا شخص حالات سے مجبور ہو کر اپنے غم و غصّہ کا اظہار بھی نہیں کر پاتا اور دل ہی دل میں کڑھتا رہتا ہے۔ زندگی کے بے شمار آلام، ان گنت جھگڑے، فسادات اور خون ریزیاں صرف اس لئے برپا ہوتی ہیں کہ ایک فریق دوسرے فریق کے ساتھ منصفانہ برتاؤ نہیں کرتا۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی دنیا میں کوئی جدل برپا ہوا ہے، یا تو وہ مذہب کے نام پر ہوا ہے یا پھر سیاسی اختلافات کی جنگ تھی۔ بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ جنگیں ردِّ عمل تھیں۔ ناانصافی کی۔ ناانصافی کا بہت گہرا اور وسیع ردِّ عمل ہے۔

انصاف ایسے رویّے کا نام ہے جو کسی دوسرے شخص سے سرزد ہو اور خود اس کی جگہ کھڑے ہو کر اسے غلط یا صحیح قرار دینا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی بھی شخص سے بھی کوئی ایسا سلوک نہ کیا جائے جو اگر خود آپ کے ساتھ کیا جاتا تو آپ پر بھی منفی ردِّ عمل ہوتا۔ بقول سیلس "جو انصاف کا طلبگار ہے اسے خود بھی انصاف پسند بننا چاہیئے"۔

ایک فلسفی کا خیال ہے کہ منصف مزاج وہ ہے کہ اگر اس کی اولاد سے بھی کوئی قصور سرزد ہو جائے تو اس کو بھی نہ چھوڑے اور کوئی رو رعایت نہ برتے!

انصاف کے بغیر کوئی سوسائٹی پُرامن نہیں رہ سکتی انسان کے سُکھ اور خوشیوں کا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ اپنے زر و مال کا جائز استعمال کر کے اس سے لطف اندوز ہو سکے۔

ساتھ وہی سلوک کرے جس کا وہ دوسرے سے تقاضا کرتا ہے
انصاف ہمارا اخلاقی و معاشرتی دونوں اعتبار سے ایک اہم فریضہ ہے۔ حالات، وقت اور مواقع کے ساتھ بدلتے بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن انصاف اپنے محور کے آگے ہی ایک ہی رفتار سے گھومتا رہتا ہے۔ اجتماعی شعور کی بیداری اور انصاف کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

ملوکیت ہو یا ڈکٹیٹرشپ، سلطنت ہو یا جمہوریت، انصاف کسی نہ کسی شکل میں پروان چڑھتا رہا ہے اور جابر و عاقر سلاطین کو بھی اس کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے عوامی حقوق کا تحفظ مساوات و برادری کی فضا بندی اور رواداری و احترام کا سلوک، یہ ساری خوبیاں انصاف کے زمرے میں شامل ہیں۔ افکار و کردار کی آزادی دوسرے حقوق کی بازیافت، مساویانہ سلوک اور اجتماعی حقوق کو ملحوظ رکھنا، یہ تمام باتیں انسانی معاشرہ کے لئے کوئی نئی چیزیں نہیں ہیں۔ قومی مزاج کو انصاف کی لہر سے آشنا کرنے کے لئے لازم ہے کہ ہر شخص اس تقاضے کی اہمیت کا اندازہ کرے اور اس کو اپنی زندگی کا جزو لاینفک بنائے۔ ارسطاطالیس کا قول ہے کہ عدل محبت کا دوسرا نام ہے اور اسی سے دنیا کی اصلاح ممکن ہے کسی شخص کو تکلیف پہونچا کر ظالم اور انصاف دشمن حاکم بھی چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔

انصاف لفظ سے مساوات کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی دوسری صفت لائق قدر نہیں۔ یہی وصف انصاف پسند کو معاشرہ میں مقبول بنا دیتا ہے۔ یوں تو انصاف پسند اور ظالم شخص دونوں کی شہرت کا نقارہ بجتا ہے لیکن انصاف پسند کا نام لوگ عزت کے ساتھ لیتے ہیں جبکہ ظالم شخص کو نفرت کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔

حضرت صدیق اکبر خلیفہ ہو گئے تھے۔ ان کے وظیفہ کا سوال زیر غور تھا۔ انہوں نے کہا "مدینہ میں ایک مزدور کی روزانہ اجرت کیا ہے وہی اُجرت میرے لئے مقرر کر دی جائے"۔ رفقا میں سے کوئی بولا۔ "صدیق! اتنے روزینے میں آپ کا گزارا کیسے ہوگا؟" حضرت صدیق نے جواب دیا۔ "یا اخی! میرا گذارا اسی طرح جس طرح ایک مزدور کا ہوتا ہے۔ ہاں اگر گذارا نہ ہوا تو میں مزدوروں کی اُجرت بڑھا دوں گا۔ تاکہ میرا وظیفہ بھی بڑھ جائے۔ جیسے جیسے مزدوروں کی اُجرت بڑھے گی، میرا معیار زندگی بھی بلند ہو جائے گا۔

دکھ اور سُکھ

دُکھ اور سُکھ ایک ہی سکّے کے دو رخ ہوتے ہیں۔ اگر ایک شخص آج پریشان اور فکر مند ہے تو پھر لازم ہے کہ کل خوشیاں بھی اس کا مقدر ہوں گی۔ اگر آج کوئی خوش و خرم ہے تو اسے کل دکھی رہنے کے لئے بھی تیار رہنا چاہئے۔ سوامی تیرتھ رام کا قولِ فیصل ہے کہ لوگ اس لئے پریشان نہیں ہوتے کہ ان کے پاس دکھ کا کوئی مداوا نہیں ہے بلکہ اس لئے دکھ جھیلتے ہیں کہ وہ اس ڈبیہ کو نہیں کھولنا چاہتے جس میں دکھ کا علاج موجود ہے۔ غم مداوا ہے اور عیش ایک آزمائش۔

گورونانک جی فرماتے ہیں کہ جہاں عیش و عشرت کا ماحول ہے وہاں خدا نہیں ہوتا۔ وہ فرماتے ہیں کہ شفاف اور نیلے پانی سے کنول اگتا ہے اور لاعلمی کی کائی بھی۔ کنول دونوں میں رہتا ہے۔ اور دونوں سے بے نیاز رہتا ہے لیکن مینڈک کو کچھ خبر نہیں ہوتی اور وہ صرف گندگی کھاتا رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ پانی میں رہتا ہے۔ لیکن محبت نام کی شئے سے واقف نہیں ہوتا۔ محبت سے تو بھونرا واقف ہے جو کنول کی عظمت

کے راگ سنتا ہے تو اس کی رگ و پے میں کنول کی محبت سرایت کر جاتی ہے یا پھر محبت کا پھول واقف ہے جو دور سے چاند کا نظارہ کرتا ہے اور بندگی میں اپنا سر جھکا دیتا ہے۔ اس کا دل جاگتا رہتا ہے امرت کی طرح میٹھے دودھ میں شہد اور شکر کا خزانہ ہوتا ہے مگر کھٹمل انہیں بالکل نہیں چکھتا ہے۔ وہ تو صرف خون چوسنے کا خوگر ہوتا ہے۔

دکھ جھیلنا آسان کام نہیں ہے لیکن عزمِ آہنی رکھنے والے، زندگی کو عمیقیت انداز نظر سے دیکھنے والے افراد اس آزمائش سے گھبرانا نہیں جانتے۔ ایسے پامرد افراد حوادث پر اشک برسانے کے بجائے ہنستے کھیلتے ہوئے جادۂ حیات سے گذر جاتے ہیں۔

مشکلات آسانیوں کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ بقول مرزا غالب
"مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہو گئیں۔

نیطشے کا نظریہ بھی یہی ہے کہ زندگی سکھ کا سرچشمہ ہے لیکن جس شخص کو غم و آلام برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں اس کے لئے تو تمام سرچشموں میں زہر ملا ہوا ہے۔

بعض لوگ سکھ کی زندگی بسر کرتے وقت یہ حقیقت بھول جاتے ہیں کہ سکھ عارضی اور ناپائیدار صورت حال ہے ان پر جب بُرا وقت آن پڑتا ہے تو وہ اپنی تقدیر کو کوس کوس کر اپنے نفس کو مطمئن کر لیتے ہیں۔ سکھ خواہ کسی نوعیت کا ہو اس پر اعتبار کرنا حماقت آمیز ہے۔ بعض لوگ دولت پاکر اتنے بدمست ہو جاتے ہیں کہ انہیں

مستقبل کا ہوش نہیں رہتا اور ان سے بیشتر سماجی و اخلاقی کوتاہیاں ہوجاتی ہیں اور وہ اپنے تنگ دائرہ سے باہر نکلنا پسند نہیں کرتے۔ پہاڑوں پر سے نیچے آنے والا پانی برف کو کبھی اپنے ساتھ بہا کر نیچے لے آتا ہے ٹھیک اسی طرح رخسار کا حسن و جمال آنسوؤں سے ڈھل جاتا ہے۔ نہ پہاڑوں کی وہ برف واپس آسکتی ہے۔ اور نہ ہی وہ حسن و جمال پھر سے لوٹ کر اپنی جگہ پر آسکتا ہے۔

اگر تیزاب میں موتی تحلیل کیا جائے تو پہلے اس کا رنگ دھوملی کی طرح ہوجاتا ہے غم اور اداسی شروع ہی سے آدمی پر اپنا کام شروع کر دیتی ہے۔ اور کچھ عرصہ کے بعد اسے ہڑپ کر لیتی ہے۔

سکھ انسان کو کمزور اور تلون مزاج بنا دیتا ہے۔ لیکن دکھ کی حالت میں وہ ثابت قدم اور اٹل ہی بنا دیتا ہے اگر کسی انسان کے ظرف کو تولنا ہو تو اسے سکھ میں آزماؤ۔ معدودے چند لوگ۔ لوگ ہی ایسے ملیں گے جو سکھ میں بھی ایک شریف رحمدل اور خوش اخلاق انسان کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایک نیک اور شریف لیکن غریب شخص پر خدا اتنا مہربان ہوا کہ وہ دیکھتے دیکھتے شہر کا مالدار ترین شخص کہلانے لگا۔ اس میں نیکی اور شرافت تو پہلے موجود تھی۔ دولت مندی نے اس خوبی کو اور زیادہ اجاگر کر دیا اس کے ارد گرد دوستوں کا ہجوم رہنے لگا۔ شہر بھر کے قابل ذکر لوگ صبح و شام سلام دعا کے لئے حاضری دیتے لیکن ان لوگوں میں

وہ ادھیڑ عمر کا نک چڑھا فلسفی ایک بار بھی نہ آیا جو دورِ غربت میں اکثر ملتا رہتا تھا۔ اور اپنی پیاری پیاری دانشمندانہ باتوں سے اس دولت مند کا حوصلہ بڑھاتا رہتا تھا بڑے انتظار کے بعد یہ شریف دولت مند اس فلسفی کے گھر خود پہنچ گیا۔ فلسفی نے بڑے اخلاق سے اس کا استقبال کیا۔ دولت مند نے شکایتاً کہا۔ "دولتمند! تم یقین کرو میرے پاس ایک زمانہ آتا ہے لیکن میری آنکھیں صرف تمہیں تلاش کرتی رہتی ہیں۔ اور جب میں تمہاری آمد کی طرف سے بالکل مایوس ہو گیا تو تم سے ملاقات کرنے کے لئے خود ہی چلا آیا"

فلسفی نے جواب دیا" اگر تم نہ آتے تو تمہارے پاس میں خود جاتا لیکن صرف ایک بار پہلی اور آخری بار"

دولت مند نے سوال کیا" پہلی اور آخری بار یعنی؟

فلسفی نے جواب دیا" ہاں پہلی اور آخری بار میں تمہیں یہ بتانے کے لئے حاضر ہوتا کہ اب تم دولت مند ہو چکے ہو، اس لئے اس دولت کی قدر کرو۔ کیونکہ دولت جب آتی ہے تو سارے جہان کی خوبیوں کو بھی اپنے ساتھ لاتی ہے۔ لیکن جب یہ آکے چلی جاتی ہے تو اپنے ساتھ پہلی خوبیاں بھی لے جاتی ہے۔

انسان کے حصے میں پہلے ہی کافی دکھ آیا ہے لیکن وہ رنج والم میں مبتلا ہو کر اس کی مقدار کو اور بھی بڑھا لیتا ہے۔ بنی نوع انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنی حالت پر غور کرے۔ نہ وہ محاسبہ کرے کہ وہ

کیسا ہے مگر سکھ میں اس کی کون پرواہ کرتا ہے؟

خوش مزاج آدمی کو دیکھ کر رنجیدہ شخص کے لبوں پر بھی مسکراہٹ دوڑ جاتی ہے۔ لیکن جو شخص اداس ہو اس کی اداسی اور پژمردگی کو دیکھ کر خوش مزاج کی مسکراہٹ بھی غائب ہو جاتی ہے۔ اس اداسی کا سبب کیا ہوتا ہے؟ ہمت و حوصلہ کی کمی اگر انسان حوادث کے تھپیڑوں کے آگے اپنی سپر ڈال دیتا ہے تو پھر یہ یقینی ہے کہ وہ رنج و الم میں مبتلا رہے گا۔ اور پھر اس عفریت سے مقابلہ کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔

وقت

وقت کی اہمیت کا اندازہ ہر شخص ہر معاشرہ اور ہر تہذیب کو ہر زمانہ میں رہا ہے۔ وقت ایک ایسا قیمتی سرمایہ ہے جو ہر شخص کو بے کم و کاست قدرت کی جانب سے عطا ہوا ہے جو لوگ اس سرمایہ کو معقول طریقہ سے اپنے کام میں لاتے ہیں وہی عیش اور مسرت و شادمانی سے ہم کنار ہوتے ہیں۔ وقت کی بدولت وحشی انسان بھی مہذب اور حسین سیرت بن جاتا ہے۔ اس کی برکت سے جاہل ایک عالم مفلس ایک تونگر اور نادان ایک تجربہ کار کہلاتا ہے۔ اطمینان خوشی اور آرام انسان کو کسی صورت حاصل نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ وہ مناسب ڈھنگ سے اپنے اوقات کا اسراف نہ کرے۔

وقت بلا خوف تردید ایک دولت ہے جو شخص اس دولت کو بے اندازہ اور بے حساب خرچ کر دیتا ہے وہ بعد میں پچھتاتا ہے اور روز بروز تہی داماں اور مفلوک الحال ہوتا جاتا ہے۔ وہ جب تک حیات رہتا ہے ہمیشہ رنجیدہ و پریشان اور زمانہ کا شکوہ

سنج رہتا ہے۔ موت بھی اس کو اس پشیمانی سے اس اندوہ سے نجات نہیں دلا سکتی۔ یہ امر مسلّمہ ہے کہ وقت کا ضائع کر دینا بھی ایک طرح کی خودکشی کے مترادف ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ خودکشی انسان کو ہمیشہ کے لئے زندگی سے محروم کر دیتی ہے اور تضیعِ اوقات ایک محدود زمانے تک اسے مردہ بنا دیتی ہے انسان کی زندگی کی مختصر گھڑیاں، منٹ، گھنٹے، اور دن ہوتے ہیں جو کہ غفلت شعاری اور بیکاری میں بیت جاتے ہیں اگر وہ حساب لگائے تو انکی تعداد مہینوں بلکہ برسوں تک پہنچتی ہے۔ الغرض کسی شخص سے یہ کہا جائے کہ تیری عمر میں سے دس پانچ برس کم کر دیئے گئے تو یقیناً اس کو صدمۂ عظیم ہوگا۔ لیکن وہ خود معطّل بیٹھا ہوا اپنی عمرِ عزیز کو برباد کر دیتا ہے تو اس بربادی پر اسے کوئی افسوس نہیں ہوتا۔

بیکار آدمی کے خیالات ناپاک اور اور پراگندہ ہو جاتے ہیں چنانچہ انگریزی میں ایک مثل مشہور ہے کہ کچھ نہ کرنا دلیل ہے کچھ نہ کچھ برائی کرنے کی۔ طمع، حرص، ظلم، حق تلفی، نافرمانی اکثر وہی لوگ کیا کرتے ہیں جو اصل میں معطّل اور بیکار ہوتے ہیں۔ اور جن کے نزدیک وقت کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کو کچھ نہ کچھ کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تخلیقِ آدم کا مقصد اشرف المخلوقات سے ایسے کام لینا بھی ہے جو ملائک سے نہیں لیا جا سکتا تھا۔

ہر کام کے لئے ایک خاص وقت اور ہر وقت کے لئے ایک خاص کام مقرر ہوتا ہے۔ ایک سست آدمی نے کسی سے پوچھا کہ تمہاری آنکھ تو بہت سویرے کھل جاتی ہے لیکن تم بہت دیر میں اٹھتے ہو۔ اتنے دن چڑھے تک بچھونے میں پڑے ہوئے کیا کرتے ہو؟ سست آدمی نے جواب دیا کہ میاں تم کیا جانو، میں ایک بڑا پیچیدہ مقدمہ فیصل کیا کرتا ہوں۔

جب میری آنکھ کھلتی ہے تو دو شخص میرے پاس آتے ہیں۔ ایک کا نام چستی اور دوسرے کا نام سستی ہے۔ وہ شخص جس کا نام چستی ہے مجھ سے کہتا ہے کہ جلد اٹھ کر دنیا کے کاروبار میں مشغول ہونا چاہئے۔ اس کے جواب میں دوسرا شخص جس کا نام سستی ہے، کہتا ہے کہ ابھی اٹھنے کا وقت نہیں آیا۔ دنیا بھر کے کاموں کے لئے بہترا دن پڑا ہوا ہے۔ یہ خنکی کا وقت ہے آرام کرنا چاہئے۔ غرض بہت دیر تک یہ دونوں فریقین ایک دوسرے سے بحث و تکرار کرتے ہیں اور میں دونوں میں پنچایت کیا کرتا ہوں۔ تم ہی انصاف سے کہو کہ ایسا پیچیدہ مقدمہ کیونکر جلد فیصل ہو سکتا ہے۔

وقت کی پابندی ایک اخلاقی و سماجی فرض بھی ہے اور شادمانی کا سرچشمہ بھی۔ اس کا خیال رکھنے والوں کو نہ صرف سماجی طور پر سر بلندی حاصل ہو جاتی ہے بلکہ ان کو ذہنی اور قلبی سکون بھی میسر ہوتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ اس تقاضہ کا خیال نہیں رکھتے وہ اپنی زندگی میں کبھی خوش و خرم نہیں رہ سکتے۔ وقت کی پابندی شخصیت کی آئینہ دار بھی ہوتی ہے اور اس سے انسان کی شخصیت کو بہ آسانی پرکھا جا سکتا ہے۔

کسی کام کو اس کے وقت سے نہ ٹالو کیوں کہ جس وقت پر تم اسے ٹالتے ہو اس کے لئے بھی کوئی نہ کوئی کام ضرور ہو گا اور ہجوم کار کے دور میں اس کام کے لئے رتی برابر بھی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ وقت کی پابندی سے شخصیت کے تین میں چار چاند لگ جاتے ہیں وقت ایسی جائداد ہے جیسے ایک چٹیل بنجر زمین جس پر نہ تو کوئی درخت نمودار ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس پر کاشت کرنا ممکن ہے مگر اس بنجر زمین پر ہر قسم کی استعداد موجود ہوتی ہے۔ وقت بھی اسی طرح کی بنجر زمین کی مانند ہے جس میں بظاہر کوئی خوبی نہیں لیکن انسان اپنی فہم و ادراک سے اس کو قابل کاشت بنا لیتا ہے۔

جو شخص اپنی عمر کی محدود گھڑیوں کی قدر کرنا جانتا ہے اور اپنی زندگی کے دنوں کو غنیمت خیال کر کے انہیں رائیگاں نہیں ہونے دیتا وہ شخص یقیناً کامیاب انسان کہلانے کا مستحق ہے۔ ایسا شخص وقت کا مزاج داں اور قدر داں کہلایا جا سکتا ہے فلسفیوں اور دانشوروں نے بجا طور پر کہا ہے کہ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

جو ناداں لوگ گھڑیوں اور ساعتوں کے رمز شناسوں پر تمسخر کرتے ہیں وہ اصل میں زندگی کی ناپائیداری اور انسان کو ودیعت ہونے والی سانسوں کی حقیقت سے بے خبر معلوم ہوتے ہیں کیوں کہ وقت نکل جانے کے بعد وہی لوگ دوسرے افراد کے پُر مسرت اور کامیاب حالاتِ زندگی کو دیکھ کر ان سے حسد کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور انہیں اپنی کوتاہیوں اور فروگزاشتوں کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ اشیاء کی تبدیلی اور واقعات کے لئے وقت کا یقین ہو چکا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ وقت کا سلسلۂ لامتناہی ہے جس سے ہم اس سائنسی دور میں بخوبی آگاہ ہو گئے ہیں۔ اور وقت کی پیمائش کا بھی ادراک پیدا ہو گیا ہے۔

وقت عمرانی اہمیت کا حامل ہے جس سے فرد کے علاوہ معاشرہ بھی متاثر ہوتا ہے۔ انسان اور انسانیت زماں ومکاں کے حدود میں رہ کر زندگی گزارتے ہیں۔ اور بعد میں اس کو تہذیب کا نام دیا جاتا ہے۔ وقت ایسا سانچہ ہے جس میں زندگی کا ہر نشیب اور ہر فراز ڈھل جاتا ہے۔ یہ وہ شے ہے جس کو آج تک انسانیت بھی تسخیر نہیں کر سکتی ہے۔

ایک شخص نے سقراط سے سوال کیا کہ اس کا کیا سبب ہے کہ میں نے تجھ کو کبھی افسردہ نہیں دیکھا۔ اس نے جواب دیا کہ میں

وقت کی اہمیت کا قائل ہوں اور اس کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ وقت سب سے بڑا استاد ہے۔ میں اپنے پاس کوئی ایسی چیز نہیں رکھتا جس کے تلف ہو جانے کا مجھے قلق ہو۔ لیکن وقت کے رائگاں جانے کا مجھے بہت صدمہ ہوتا ہے۔

محنت

محنت انسان کا وہ خارجی وصف ہے جو اسے اپنے معاشرہ میں طرۂ امتیاز بخش دیتا ہے جو قوم یا افراد محنت سے کتراتے ہیں وہ ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتے۔ مشہور مقولہ ہے کہ محنت کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ جو محنت سے کام کرے گا۔ کبھی بھوکا نہیں رہ سکتا۔ جو دل لگا کر خدا کا دھیان کرے گا اس سے گناہ کبیرہ کا ارتکاب نہیں ہو سکتا۔ جو ہشیار رہے گا وہ کبھی خوف سے دوچار نہ ہوگا۔ اور جو سمجھ کر بات کریگا کبھی جھگڑوں میں گرفتار نہیں ہوگا۔

دنیا کی عجیب ترین بات یہ ہے کہ اس کے تمام حصّوں میں دن اور رات محنت و آرام، جلدی و آہستگی ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں۔ یہ وہ تبدیلیاں ہیں جو دل کو ہر وقت کام پر آمادہ رکھتی ہیں۔ بین جانسن کا قول ہے کہ ہمارے دل میں کسی شے کی خواہش پیدا ہوتی ہے تو ہم اس کا تعاقب کرتے ہیں

"برٹن کہتا ہے کہ چیونٹی کی طرح محنت اور کفایت شعاری کرو"۔ درحقیقت چیونٹی میں جہدِ پیہم کا جذبہ ہوتا ہے جو اُسے متواتر ناکامیوں کے باوجود مسلسل کوشش کرنے پر آمادہ کرتا رہتا ہے۔ بکسٹن کا خیال ہے کہ کسی کام میں ہمہ تن مصروف ہونا ہی کامیابی کی دلیل ہے۔

فاروق اعظم فرماتے ہیں۔

"کسی مسلمان کو یہ زیبا نہیں کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے اور دعا کرے کہ اے خدا مجھے رزق دے کیوں کہ ہمیں معلوم ہے کہ آسمان سے چاندی اور سونا نہیں برستا"۔

وہ آگے فرماتے ہیں۔

"اگر میری موت اس حالت میں آئے کہ میں محنت و کوشش سے اپنی روزی تلاش کر رہا ہوں تو مجھے یہ اس سے زیادہ پسند ہے کہ خدا کی راہ میں غازی بن کر مر جاؤں"۔

محنت و کاوش انسان کا وہ جوہر ہے جو اچھے نتائج برآمد کرتا ہے سستی اور کاہلی سے قوم کی قوم تباہ ہو جاتی ہے جبکہ محنت و مشقت کے ذریعہ لٹی پٹی قوموں کی تقدیریں بدل سکتی ہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں جرمنی اور جاپان کو سب سے زیادہ مادی نقصان

پہونچا تھا لیکن محنت کی بدولت دونوں ممالک کے عوام نے یہ دکھا دیا کہ مالی اعتبار سے آج بھی یہ قومیں ترقی یافتہ ہیں سچ ہے کہ ڈھول کی آواز اس لئے ہوتی ہے کہ اس کا پیٹ خالی ہے۔

محنت سے تقدیر بدل جاتی ہے محنت تدبیر کا دوسرا نام ہے۔

ایمرسن نے درست لکھا ہے کہ ہر شخص کو سمجھ لینا چاہئے کہ دنیا میں ہر کام قوانین قدرت کے مطابق ہوتا ہے نہ کہ تقدیر کے مطابق جو شخص جیسا بوتا ہے اس کا پھل اسے ضرور ملتا ہے۔ زندگی کی امیدوں کا انحصار محنت پر ہے۔ جو کاریگر اپنا کام مکمل کرنا چاہتا ہے، اس کے لئے لازم ہے کہ وہ پہلے اپنے ہتھیار تیز کرلے۔ جو شخص کوئی کام نہیں کرتا اور یہ سمجھتا ہے کہ اس کے لئے دنیا میں کوئی کام کرنے کو نہیں ہے یا اسے اپنے تمول کے باعث محنت کی احتیاج نہیں ہے اس کی حالت قابل رحم اور سزاوارِ افسوس ہے

مغربی ممالک میں جہاں آبادی کم ہے وہاں "اپنے کام" کی روایت صدیوں سے چلی آرہی ہے۔ ان ممالک میں محنت کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔

ترقی یافتہ ممالک کے لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ جو کام خود کیا جاسکتا ہے اسے دوسروں سے کیونکر ایا جائے۔

اور جو کام آج ہو سکتا ہے اس کو کل پر کیوں چھوڑا جائے۔ محنتی اور جفاکش آدمی کی نیند خواہ وہ کم کھائے یا زیادہ میٹھی ہوتی ہے لیکن مال کی فراوانی اسے کبھی چین سے نہ سونے دے گی۔

کسی نے بر سبیل مزاح کیا خوب کہا تھا کہ دنیا میں کوئی محنت کا قدر دان ہوتا تو گدھا سب سے زیادہ قابل قدر ہوتا۔ تلوک چند محروم کے چند اشعار اس موضوع پر ملاحظہ فرمائیے۔

محنت تقدیر کا دایاں ہاتھ ہے
محنت سے مصیبت بھاگتی ہے
بالش سنگ بھی اگر مل جائے
چین سے اُس پر سوتی ہے محنت
نرم ہو لاکھ بستر سنجاب
اس پر بے چین ہوتی ہے عشرت

درگذر یا حلم

حلم یا درگذر کا مطلب یہ ہے کہ کسی کی ایزا رسانی نہ کی جائے اشتعال انگیزی کو عالی حوصلگی اور اعلیٰ ظرفی کے ساتھ برداشت کر لیا جائے اور انتقام سے گریز کیا جائے۔ سزا دینے کی پوری قوت رکھنے کے باوجود قصوروار شخص کو تکلیف نہ پہنچائی جائے اور اس کو غیر مشروط طریقے سے معاف کر دیا جائے ایسے شخص کا ہر مذہب اور ہر سوسائٹی میں اونچا مقام ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

"وہ بندے جو راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں، خوشحالی میں بھی اور تنگدستی میں بھی اور جو پی جانے والے ہیں غصہ کو اور معاف کر دینے والے ہیں لوگوں کے قصور اور اللہ تعالیٰ ایسے نیکوکار بندوں سے محبت کرتا ہے۔"

واقعہ یہ ہے کہ جو شخص اپنے ظالم کو بد دعا دیتا ہے، وہ اپنا بدلہ لے لیتا ہے۔ سرور کائنات محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جس بڑھیا نے ایذا پہنچائی تھی اور جو روزانہ ان کے جسم مبارک پر کوڑا پھینکا کرتی تھی، ایک مرتبہ بیمار پڑ گئی۔ حضور کریم نے جب دیکھا کہ بڑھیا نے ان کے جسم مبارک کو کوڑا نہیں پھینکا ہے تو وہ خود بہ نفس نفیس اس بڑھیا کے گھر چلے گئے اور اس کی مزاج پرسی بھی کی۔ بڑھیا صاحب فراش تھی۔ جب اس نے عظیم المرتبت شخصیت کو اپنی عیادت کے لئے آتا ہوا دیکھا تو شرمندہ ہو گئی اور اسلام قبول کر لیا۔

حضرت غوث الاعظم فرماتے ہیں "خالق کا مقرب وہی بنتا ہے جو مخلوق پر شفقت کرتا ہے"۔ رسول اللہ کا ارشاد ہے "اچھا مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ محفوظ رہیں"۔

ایک حکایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ نیکوکار حکمران کے کردار کی بلندی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے،

ایک شکستہ حال ضعیفہ خلیفہ مامون رشید کے دربار میں آئی اور شکایت کرنے لگی کہ ایک غاصب و جابر نے میری جائداد چھین لی ہے۔ مامون نے پوچھا "کس نے اور وہ کہاں ہے؟" بڑھیا نے اشارہ سے بتایا کہ "وہ شخص آپ کے پہلو میں بیٹھا ہے"

مامون نے دیکھا تو وہ خود بادشاہ کا بیٹا عباس تھا۔ وزیر کو حکم دیا گیا کہ شہزادے کو بڑھیا کے برابر لیجا کر کھڑا کر دیا جائے۔ دونوں فریقوں نے دربار میں اپنا موقف بیان کیا۔ شہزادہ رک رک کر آہستہ آہستہ گفتگو کرتا تھا مگر بڑھیا بے دھڑک بلند آواز سے گفتگو مسلسل کرتی گئی۔ وزیر نے بڑھیا کو روکا کہ خلیفہ کے سامنے چلا کر بولنا بے ادبی کے مترادف ہے۔" مامون نے کہا کہ "اسے جس طرح چاہے اسے آزادی سے بولنے دو۔ سچائی نے اس کی زبان کو تیز اور عباس کو روک دیا ہے۔ جب دونوں کے بیانات ختم ہو گئے تو مامون نے فیصلہ بڑھیا کے حق میں سنایا۔ اور جائداد اسے واپس دلا دی۔ معقول رقم عباس سے بطور جرمانہ وصول کر کے بڑھیا کو دلا دی گئی تاکہ اس کی تکلیف کا کچھ معاوضہ مل سکے۔

حضرت امام حسینؓ نے حضرت امام حسنؓ کے آخری ایام میں ہر چند کوشش کی کہ امام حسنؓ یہ بتا دیں کہ آپؓ کو کس شخص نے زہر دیا ہے۔ مگر آپ نے نہ بتلایا اور فرمایا کہ جس پر میرا شبہ ہے اگر وہی قاتل ہے تو خدا خود منتقم حقیقی ہے۔ اور اگر دراصل وہ نہیں ہے تو میرے واسطے کوئی ناحق کیوں قتل کیا جائے

خاکساری

خاکساری اپنی انا اور نفس کو قابو میں رکھنے کا دوسرا نام ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب شعر کہا ہے:

؎ چھوڑ کر اپنی تعلی کر تواضع اختیار ÷ رتبہ مسجد کے منارے کا ہے کم محراب سے

ایک شخص نے ایک سادھو کے مزاج کا امتحان لینا چاہا وہ سادھو کی کٹیا میں گیا تو دیکھا کہ مہاراج اپنی گدی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس نے سوال کیا۔ مہاراج تھوڑی سی آگ دید یجئے"۔ سادھو بولا۔" بھائی آگ میری کٹیا میں نہیں"۔ دراصل آگ تھی بھی نہیں۔ لیکن چوں کہ اس شخص کو سادھو کا امتحان لینا مقصود تھا اس لئے اس نے پھر پوچھا:

"مہاراج آگ تھوڑی ہی سی دید یجئے"۔ اس پر سادھو بے حد جزبز ہوا اور غضبناک آواز میں بولا۔" چلا جا، کیسا آدمی ہے ہم تو کہتے ہیں آگ نہیں ہے، مگر تو مانتا ہی نہیں"۔ وہ شخص پھر بولا۔ "مہاراج دھواں تو اٹھتا ہے۔ تھوڑی سی آگ دید یجئے۔ اب تو سادھو آگ بگولہ ہو گیا اور مارے غصہ کے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

اور سونٹا اٹھا کر مارنے کو دوڑا۔ اس شخص نے ہاتھ جوڑے اور سادھو کے پاؤں پڑ گیا۔ بولا: "اب تو آگ اچھی طرح سے جلنے لگی چھما کیجئے۔ اور میری گستاخی معاف کیجئے"۔ سادھو نے کہا۔ تو مجھ سے بار بار آگ مانگتا تھا؟ اس شخص نے کہا: "مہاراج میں آپ کی خاکساری کو آزما رہا تھا۔ جو غصہ آپ کو شروع میں آیا تھا، وہ آگ کا سلگنا اور دھوئیں کا اٹھنا تھا۔ اور جو بعد میں غصہ بڑھ گیا تھا، وہ گویا آگ کا پورے طور پر بھڑک اٹھنا تھا۔"

اچھے اخلاق کا بیّن ثبوت خاکساری کے اظہار سے ملتا ہے حضرت عمر فاروقؓ کی خاکساری کا یہ عالم تھا کہ آپ نے فرمایا کہ عمرؓ کے لئے سوائے ان چیزوں کے اللہ تعالیٰ کے مال سے اپنا حلال نہیں ہے۔ صرف دو کپڑے جاڑوں کے اور دو گرمیوں کے۔ حج اور عمرے کا خرچ اپنے اور اہل و عیال کے لئے کھانا۔ آپ کا معمول یہ تھا کہ جب آپ کسی کو عامل (گورنر) بنا کر کہیں بھیجتے تو یہ ہدایات فرماتے تھے۔ کہ ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہونا، بہترین کھانا نہ کھانا، باریک کپڑا نہ پہننا، اہل حاجات کے لئے اپنا دروازہ بند نہ کرنا۔ ایک مرتبہ خلافت کے ہی زمانہ کی بات ہے۔ حضرت عمرؓ اپنے کاندھے پر مشک لاد کر چلے جا رہے تھے، لوگوں نے اس کا سبب پوچھا کہ یہ حالت کیوں اختیار کی ہے، جواب ملا کہ میرے نفس میں بڑائی پیدا ہو گئی تھی۔ اس لئے اس کو سزا دے کر ذلیل کیا ہے۔

آپ کے صاحبزادے فرماتے ہیں کہ میں نے والد بزرگوار کو کبھی نہیں دیکھا کہ آپ کو غصہ آیا ہو۔ اور اس وقت کسی نے اللہ کا ذکر کیا یا خوف خدا یاد دلایا قرآن پاک کی کوئی آیت تلاوت کی ہو تب بھی آپ کا غصہ رفع نہ ہوا ہو۔

خاکساری کی صفت اس شخص میں ہوتی ہے جو بے نفس ہوتا ہے جو اپنے اعمال کی مذمت کرنے اور دوسروں کی تعریف کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے نفسیانی خواہشات کو پسپا کرنے کے بعد انسان خاکساری کی طرف مائل ہوتا ہے۔

حسن بصریؒ فرماتے ہیں: "دنیا میں کوئی سرکش جانور تیرے نفس سے زیادہ سخت لگام کے لائق نہیں"

عثمان الخیری کا قول ہے کہ "لوگوں کو حقیر جاننا اور بُرا سمجھنا ایسی بیماری ہے جو دوا قبول نہیں کرتی"۔

امام غزالی کا قول: "بد خلقی سے دشمنی پیدا ہوتی ہے اور دشمنی سے جفا کاری"۔ حدیث میں آیا ہے کہ جس کا اخلاق اچھا ہو گا قیامت میں وہی مجھے پیارا اور میرے پاس ہو گا"

SHAMA FIROZAN

